نفحۃ المصدور

اور

ہندوستان کی شرعی حیثیت

سعید احمد اکبرآبادی
صدر شعبۂ سُنّی دینیات

علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Marfat.com

فہرس

۱۔ نفثۃ المصدور

تعارف

متن

۲۔ ہندوستان کی شرعی حیثیت

Marfat.com

دارالعہد، جو تھا دار یعنی ان لوگوں کا ملک جو ناطرفدار اور غیر جانبدار ہوں وہ ناپید تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ اس زمانہ میں جو غیر مسلم حکومتیں مسلمانوں کے اطراف واکناف میں تھیں، ان کی ریشہ دوانیوں کے باعث مسلمان ان کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے اس بنا پر مسلمان ان حکومتوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ عہد و پیمانِ امن کریں، اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو اب ان کے لیے اسلام یا جنگ یہ صرف دو راہیں کھلی ہوئی ہیں جس کو چاہیں اختیار کرلیں۔" [1]

یہی بات عہدِ حاضر کے نامور عالم اور محقق شیخ عبد القادر عودہ نے کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"اسلامی نظریات جو تمام بلادِ اجنبیہ کو ایک دارِحرب قرار دیتے ہیں۔ باوجودیکہ ان کی حکومتیں مختلف ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان ترکستان، روس، ہند، اسپین، فرانس اور روم ان سب ملکوں کی حکومتوں سے جنگ کر رہے تھے۔ اس بنا پر وہ ان سب ملکوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی دارِحرب کہتے تھے۔" [2]

اس بنا پر ہمارے علماء کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ عہدِ بنی عباس کے اوائل میں فقہائے کرام نے دار کی جو تقسیم کی اور اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ اس زمانہ کے مخصوص وقتی اور مقامی حالات کا نتیجہ ہے جب کہ جنگ کی بنیادی وجہ مذہب ہوتا تھا اور اسی بنیاد پر مسلمان ایک عالمگیر جنگ سے دوچار تھے۔ یہ حالات کا دباؤ کس قدر شدید ہوتا اور فکر و نظر کے سانچے اور پیمانے کس طرح بدل دیتا ہے؟ اس کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ فرمایئے :

حالات کے دباؤ کی ایک عجیب مثال صلحِ حدیبیہ کے ذکر کے سلسلے میں آپ اوپر ابو رافع قبطی کا واقعہ پڑھ آئے ہیں کہ یہ قریش کی طرف سے سفیر بن کر آئے تھے،

---

[1] مقالہ "العلاقات الدولیۃ فی الاسلام" مطبوعہ الازہر بابت ماہ ۔ ۔ ۔ ص ۲۷۲

[2] التشریع الجنائی الاسلامی جلد اول ص ۲۹۱

لیکن حضور انورؐ کو دیکھتے ہی انھوں نے اسلام کو قبول کرنا چاہا، اور عرض کیا کہ اب میں قریش کی طرف واپس نہیں جاؤں گا۔ لیکن حضورؐ نے ان کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی۔ انھیں واپس کر دیا اور فرمایا "میں نہ بد عہدی کرتا ہوں اور نہ قاصدوں کو حبس کرتا ہوں" اس واقعہ کو اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید میں وفائے عہد کے جو احکام بڑی تاکید کے ساتھ ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر سوچیے کہ اس طرح کا معاملہ جب کبھی پیش آئے تو اس وقت اسلامی حکومت کا عمل کیا ہونا چاہیے؟ حضورؐ چونکہ ہر معاملہ میں ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں اس بنا پر یقیناً اسلامی حکومت کو وہی کرنا چاہیے جو اس واقعہ میں آپؐ نے کیا۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ امام ابو داؤد اپنی سنن میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

هذا كان في ذالك الزمان واليوم لا يصلح — یہ اس زمانہ میں تھا مگر آج یہ مناسب نہیں ہے۔

اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ اسے شارح سنن ابی داؤد کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں:

والمراد بهذا الكلام ان من جاءَ	اور اس کلام سے مراد یہ ہے کہ کفار کی طرف سے
من الكفار الى الامام رسولاً	اگر کوئی شخص امام کے پاس پیغمبر بن کر آئے اور
فاسلم واراد ان لا يرجع الى الكفار	مسلمان ہو جائے اور واپس نہ جانے کا ارادہ
لا يرده الامام اليهم۔ واما ان	کرے تو امام اس کو واپس نہ کرے۔ اب رہی یہ
رسول الله صلى الله عليه وسلم	بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع
لم يحبس ابا رافع وهو من	کو نہیں روکا تھا تو یہ ان چیزوں میں سے ہے جو
المخصوص به صلى الله عليه وسلمؐ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں۔

حقیقت یہ ہے۔ جیسا کہ میں نے نرمگل یونیورسٹی میں ایک لکچر میں کہا تھا۔ تاریخ مذاہب عالم کا یہ بڑا دردانگیز سانحہ ہے کہ مذہب جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے ماننے والوں کو ایک خاص تربیت دے کر ایک سوسائٹی پیدا کرتا ہے، یہ سوسائٹی ایک تاریخ پیدا کرتی ہے، لیکن دو تین نسلوں کے بعد تاریخ مذہب کی جگہ لے لیتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب اپنی شکل و

لہ بذل المجہود جلد ۴ ص ۵۶ مطبوعہ جید برقی پریس۔

Marfat.com

صورت میں نظر انداز ہو جاتا ہے اور پھر جتنے فیصلے ہوتے ہیں وہ سب تاریخ کی روشنی میں ہوتے ہیں، چنانچہ اسلام کے ساتھ بھی معاملہ یہی پیش آیا۔ علم الکلام، فقہ، تصوف اور تاویل یہ وہ چیزیں ہیں جن کو تاریخ نے پیدا کیا ہے لیکن یہی چیزیں ہمارے فکر و نظر کا معیار بن گئی ہیں، اور قرآن و سنت جو مذہب کے اصل سرچشمے ہیں ان کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے یعنی اگر آپ مثلاً حنفی ہیں تو وہی کہیں گے جو فقہائے احناف نے کہا ہے اور پھر قرآن و سنت سے اس کے لیے ثبوت فراہم کریں گے، حالاں کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے آپ براہ راست مخلا بالطبع ہو کر قرآن و سنت کی روشنی میں غور کریں اور اس کے بعد فقہا کے اقوال کا جائزہ لیں۔

بہر حال اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ دار، از روئے قرآن دو یا تین نہیں بلکہ چار ہیں اور ہر دار کسی کی قسم نہیں بلکہ مستقل بالذات ہے اور ان کے احکام الگ الگ ہیں تو اب موقع ہے کہ اصل سوال کا جواب دیا جائے۔ یعنی یہ کہ اچھا! جب ہندوستان دار الحرب نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ جواب یہ ہے ہندوستان جس طرح دار الحرب نہیں ہے دار الاسلام بھی نہیں ہے اور دار العہد اور دار الامن بھی نہیں ہے۔ کیوں؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ جب ہم ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک اس ملک کی شرعی حیثیت مسلمان ملکوں اور حکومتوں کے لیے اور دوسرے خود اس ملک کے مسلمانوں کے لیے، جہاں تک امراول کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت مسلمان ملکوں اور حکومتوں کے لیے "دار العہد" کی ہے، پھر یہ عہد اور مختلف معاملات و مسائل میں اشتراکیت و تعاون جتنا زیادہ ہو گا اسی قدر ایک مسلمان ملک کا تعلق ہندوستان کے ساتھ زیادہ ہو گا۔ مثلاً ایک ملک کے ساتھ وہ برطانوی کامن ولتھ میں بھی شریک اور مجلس اقوام متحدہ میں بھی! اور ایک ملک کے ساتھ یہ دونوں رشتے بھی ہیں اور ان کے علاوہ کچھ اور تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی علائق و روابط بھی ہیں، ظاہر ہے ان دونوں قسم کے ملکوں کے ساتھ "دار العہد" ہونے کا رشتہ ایک ہی درجہ اور مرتبہ کا نہیں ہو سکتا، بہر حال جس مسلمان ملک کے لیے ہندوستان جس درجہ کا دار العہد ہے اس ملک کی حکومت کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اس کا احترام

کرے اور عہد و پیمان کے جملہ شرائط کو صورۃً و معنیً پورا کرے۔[لہ]

اب رہا خود ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ! تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ ملک دار کی چاروں قسموں میں سے کوئی قسم نہیں ہے۔ دار الحرب نہ ہونے پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے، رہے باقی تین دار! تو اس کا دار الاسلام نہ ہونا ایسا ظاہر ہے کہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس ملک کی حکومت ہی سیکولر اور لادینی ہو اس کے دار الاسلام ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے! اگر چہ ہمارے جن علما نے انگریزوں کے زمانے کے ہندوستان کو انگریزی حکومت کے سیکولر ہونے کے باوجود دار الاسلام کہا ہے۔ وہ موجودہ آزاد ہندوستان کو بدرجۂ اولیٰ دار الاسلام کہیں گے لیکن ہم ابھی آگے چل کر بتائیں گے کہ ان کا وہ فیصلہ غلط تھا اور یہ بھی غلط ہوگا۔ کیوں کہ درحقیقت ان حضرات کا تصورِ دار الحرب و دار الاسلام ہی صحیح نہیں۔

جس طرح ہندوستان دار الحرب اور دار الاسلام نہیں ہے اسی طرح دار العہد اور دار الامان بھی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں دار وہاں پائے جاتے ہیں۔ جہاں مسلمان ایک فریق ہوں اور غیر مسلم فریقِ ثانی ہوں اور ان دونوں میں علی الترتیب معاہد اور آمن و مستامن ہونے کا رشتہ اور تعلق پایا جائے۔ اور ظاہر ہے یہاں یہ رشتہ مفقود ہے۔ کیونکہ دستوری طور پر اور قومیت (NATIONALITY) کے موجودہ بین الاقوامی تصور کے ماتحت اس ملک کے مسلم اور غیر مسلم سب مل ملا کر ایک قوم ہیں۔ اور حکومت جو ہے وہ اسی قوم کی ہے۔ اور یہ قوم ایک دستور کی پابند ہے جس کو عملی شکل دینا اور اس کی

[لہ] فقہ کی کتابوں میں ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم ملک کسی مسلمان ملک کے ساتھ دو پیسہ میں دس آنہ احسان و کرم اور لطف و مدارات کا معاملہ کرے تو مسلمان ملک کا فرض ہے کہ اس کے جواب میں وہ غیر مسلم ملک کے ساتھ دو پیسہ میں ۱۲ یا ۱۴ کا معاملہ حسنِ اخلاق کا کرے اور فقہا اس کی دلیل میں فرماتے ہیں: "لاننا احق بالمکارم والاخلاق" یعنی بحیثیت مسلمان کے ہم کو اور زیادہ بہتر مکارمِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں اگر بالفرض ایک مسلمان بھی نہ ہوتا تو یہ ملک مسلم ممالک کے لیے انٹرنیشنل ڈپلومیٹک اصول و ضوابط کے ماتحت پھر بھی دار العہد ہوتا۔ لیکن جبکہ یہاں پانچ ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان بھی آباد ہیں، اور ان کی عظیم الشان روایات اور تاریخ ہے تو اب مسلم ملکوں کے لیے اس ملک کے ساتھ خیر سگالی اور دوستی کا برتاؤ کرنے کی ایک مزید وجہ وجیہ موجود ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ تاثانی ایک بات ہے نہیں دونوں سے بچتی ہے۔

Marfat.com

حفاظت کرنا حکومت کا فرض ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ دستور نے دیے ہیں نہ کہ اکثریت نے، اور انھیں جو کچھ شکایت کسی معاملہ میں ہو حکومت سے ہی ہو سکتی ہے جس کی تشکیل میں خود مسلمانو کا ایسا ہی حصہ ہے جیسا دوسروں کا کہ وہ دستور کی حفاظت اور دوسرے لفظوں میں ان کی نمائندگی اور اعتماد کا حق ادا نہیں کر رہی ہے، بہر حال ان وجوہ سے ہندوستان یہاں کے مسلمانوں کے لیے دار العہد اور دار الامن بھی نہیں ہے۔

اب پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں تو آخر یہ ہے کیا؟ اور شرعی طور پر اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ پہلے زمانے میں ایک ملک میں رہنے والے مختلف مذہبی طبقات کے باہمی تعلقات اور بین الاقوامی حلائق و روابط جس نہج اور جس ڈھنگ پر ہوتے تھے، آج صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے، اس بنا پر پہلے قوموں کی جو تقسیم ہوتی اور اس پر جو احکام و مسائل مرتب ہوتے تھے آج ان کا اطلاق ان قدیم مفاہیم و معانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا، باب الرقیق اور باب العتق فقہ کے بہت اہم ابواب تھے۔ مگر آج کل یہ بالکل بے کار ہیں۔ کتاب الحدود کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن آج کہاں اس پر عمل ہو رہا ہے؟ فقہ میں "ذمی" اور "ذمیہ" کے احکام و مسائل کا تذکرہ ملتا ہے لیکن آج ذمی کا وجود کس ملک میں ہے؟ یہاں اس سے بحث نہیں کہ کون سی تبدیلی صحیح ہے اور کون سی غلط؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ تبدیلی ہے یا نہیں؟ پس جب تبدیلی ہے تو لازمی طور پر اس کا اثر احکام و مسائل پر پڑے گا۔ فقہ کا مشہور اصول ہے کہ تبدیل مذہب سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے لیکن جب یہ بلا عام ہو گئی تو مولانا تھانویؒ نے علماء کے مشورہ اور ان کے اتفاق سے فتویٰ اس کے برعکس دیا اور اس پر الحیلۃ الناجزۃ للمرأۃ العاجزۃ کے نام سے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا۔ تعلیم قرآن و امامت کی اجرت کو فقہائے متقدمین نے ناجائز کہا ہے لیکن متاخرین نے اسے سند جواز عطا فرما دی۔ حلق لحیہ کو فقہائے متقدمین نے علامت فسق اور اس کے مرتکب کو مردود الشہادۃ قرار دیا۔ لیکن آج ان لوگوں کی نہ صرف یہ کہ شہادت مردود نہیں ہے بلکہ اسلامی ممالک میں امامت، درس قرآن و حدیث اور عہدۂ قضا و افتا کی کرسیوں پر متمکن ہیں۔ جن درختوں کے پھل ابھی پکے نہیں اور

Marfat.com

ان کی مقدار معلوم و معین نہیں ہے۔ فرمانِ نبوی کے مطابق ان کی بیع حلال نہیں تھی، لیکن آج ہر جگہ یہ کاروبار ہو رہا ہے اور بڑے بڑے زمین دار علماء کر رہے ہیں اور کوئی پوچھتا تک نہیں ہے۔ تصویر کھنچوانا اور رکھنا دونوں ممنوع قرار دیا گیا لیکن آج حجاز مقدس میں بھی اس کا عالم چلن اور رواج ہے۔ فقہا اس بات میں اختلاف کرتے رہے کہ عورت کا چہرہ اور اس کے دونوں ہاتھ بھی ستر میں داخل ہیں یا نہیں لیکن عورت نے پردے کے پیچھے سے وہ جست لگائی کہ جھٹ ہر شعبۂ حیات میں مرد کی شریک و سہیم نہیں بلکہ رقیب بن گئی اور اسلامی سماج نے اس کو اس خوشی سے قبول کر لیا ہے کہ دختران اسلام گرمی کے موسم میں سمندر کے کنارے غسلِ آفتابی لیتی ہیں اور کہیں پتہ بھی نہیں کھڑکتا! یہ سب کچھ کیا ہے؟ اچھا یا بُرا زمانہ کا انقلاب ہے جس نے سماجی اور معاشرتی زندگی قدروں کو اتھل پتھل کر دیا اور انھیں کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ ان میں کتنی چیزیں ہیں جو پہلے ناجائز تھیں اور اب انھیں فتویٰ کے سہارے جائز کر دیا گیا ہے اور کتنی ہی وہ ہیں جو پہلے کی طرح ناجائز یا حرام اب بھی ہیں لیکن ان سے متعلق بھی حالات کا یہ اثر ضرور ہوا ہے کہ پہلے یہ بالکل ناگوار تھیں اب گوارا ہو گئی ہیں۔ اب اگر ان چیزوں کے گوارا ہونے کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں ہے جب وقت کا مجدد اور مفتی انھیں بھی سندِ جواز عطا فرما کر محلات میں شامل کرے گا اور دنیا اسے دیکھ کر شیخ سعدی کا مقولہ " زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز " کی حکمت و مصلحت پر مہر تصدیق ثبت کرنے پر مجبور ہوگی۔

بین الاقوامی تصورِ قومیت

بہر حال جہاں تک مسئلہ زیرِ بحث کا تعلق ہے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگرچہ اسلام میں شخصی یا خاندانی حکومت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اس پر عمل صرف خلافت راشدہ کے زمانہ تک رہا اس کے بعد حکومت خلافت یا امامت سے ملوکیت کی شکل و صورت میں منتقل اور خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ جس کا موقع لگا بادشاہ بن کر بیٹھ گیا اور جب اس کا انتقال ہوا تو تخت شاہی بطور ایک ترکہ کے اس کی آل اولاد یا بھائی بھتیجوں کے حصہ میں آگیا۔ اس دور میں شاہی خاندان کے علاوہ حدودِ مملکت میں رہنے والے جتنے لوگ ہوتے تھے رعیت یا رعایا (SUBJECT)

Marfat.com

کہلاتے تھے لیکن خود رعیت دو حصوں میں تقسیم ہوتی تھی، ایک وہ لوگ جو حکمرانوں کے ہم مذہب ہوتے تھے اور دوسرے وہ جو ان کے ہم مذہب نہیں ہوتے تھے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ ملک کے شہری (CITIZENS) ہوتے تھے۔ لیکن بنیادی حقوق میں یکساں شریک ہونے کے باوجود ان دونوں میں بعض اعتبارات سے فرق و امتیاز ہوتا تھا مسلمان حکومتوں میں یہی فرق "ذمی" کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا تھا۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وہاں کے دستور میں انیسویں ترمیم سے پہلے عورتوں کو تمام حقوق شہریت حاصل تھے لیکن ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ یا آج بھی امریکہ کے جو پیدائشی باشندے ہیں اور جو وہاں آکر آباد ہو گئے ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ دوسری قسم کے لوگ پریذیڈنٹ یا وائس پریذیڈنٹ نہیں ہو سکتے۔ حکومت ایک قسم کی مذہبی ہوتی یا سمجھی جاتی تھی۔ اس بنا پر اس مذہب کے لوگوں کو یک گونہ فوقیت ہوتی تھی۔ تمام دنیا میں یہی طریقہ رائج تھا!

لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ رعایا (SUBJECT) کی جگہ شہریت (CITIZENSHIP) اور قومیت یا جنسیت (NATIONALATY) نے لے لی ہے اور حکومت کے تصور کے ساتھ ساتھ باشندگان ملک کی حیثیت کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ پہلے حکومت چند افراد یا خاندان کی ہوتی تھی، اس بنا پر حکمراں آقا اور باشندگان ملک رعایا سمجھے جاتے تھے لیکن آج حکومت عوام کی نمائندہ اور ان کی منتخب ہوتی ہے۔ اور قرون وسطیٰ کے یورپ میں جو جاگیردارانہ نظام سلطنت (FEUDAL SYSTEM OF GOVERNMENT) رائج تھا۔ اب اس کے بجائے علاقائی خود مختاری (TERRITORIAL STATE SOVEREIGNTY) کا رواج ہے اور جسے ہم اسٹیٹ کہتے ہیں وہ سب اہل ملک کا ایک کارپوریشن (CORPORATION OF MEMBER INDIVIDUALS) ہے، یورپ کا یہ تصور اسٹیٹ اور اس کے نتیجہ میں شہریت اور قومیت کا یہ تصور اب عالمگیر اور بین الاقوامی ہے جسے مسلم اور غیر مسلم سب ممالک نے تسلیم کر لیا ہے اور پاسپورٹ اور ویزا اور شہریت و قومیت سے متعلق تمام بین الاقوامی مسائل و معاملات کا انتظام و انصرام اسی پر ہے۔

شہریت۔ قومیت اور حیثیت ان جدید سیاسی بین الاقوامی تصورات
اسلامی تعریف کو ذہن میں رکھ کر اب اس پر غور کیجیے کہ آج صحیح معنی میں دارالاسلام
کون سا ملک ہو سکتا ہے؟ فقہاء کی تعریف کے مطابق دارالاسلام میں تین شرطوں کا ہونا ضروری
ہے:

۱۔ مسلمانوں کی جسے فقہاء ... کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں جس کو عقیدہ اور عمل
کے لحاظ سے اسلامی شریعت کا تحفظ اور استحکام حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ اس میں اسلامی قانون نافذ ہو چکا ہو جس کا بنیادی مقصد عدل و احسان کا قیام
اور فواحش و منکرات کا استیصال ہے۔

۳۔ مسلمان خواہ کسی ملک اور علاقہ کا باشندہ ہو اور کسی نسب سے ایک مقامی قومیت
رکھتا ہو اس کو دارالاسلام میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت ہوگی اور اسے وہاں
پہنچتے ہی وہ تمام شہری حقوق حاصل ہو جائیں گے جو وہاں کے پہلے سے رہنے والوں
کو حاصل ہیں۔ وہ وہاں زمین خرید سکتا ہے کھیتی باڑی، تجارت و کاروبار کر سکتا ہے۔
ملازمت میں [illegible] جائیداد پیدا کر سکتا ہے، اسے اختیار ہے
جب تک چاہے وہاں قیام کرے حکومت اس کو اخراج کا حکم نہیں دے سکتی
اسی بنا پر مسلمان اگر کسی دوسرے ملک میں کسی جرم کا ارتکاب کر کے آیا ہے تو دارالاسلام
کی حکومت کو حق ہوگا کہ وہ اسے سزا دے۔

دارالاسلام کے ان شرائط سہ گانہ کو جو تقویمی ہیں نہ کہ تقسیمی، پیش نظر رکھ کر سوچیے کہ
دارالاسلام کی یہ تعریف آج کسی مسلم ملک پر صادق آتی ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے ایک موقع
پر لکھا تھا پھر کہتے ہیں کہ اگر آپ نے یہ کوئی اصطلاح ہی بنا لی ہے کہ جس ملک میں مسلمان اکثریت
میں ہوں گے آپ اسے دارالاسلام کہیں گے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے
کہ جس ملک میں فواحش و منکرات عام ہوں گے ______ اور ملک
کا قانون ان کا انسداد نہ کرتا ہو اس کو دارالاسلام کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شاندار
محل ہو جس میں برہنہ عورتوں کے مجسمے جابجا نصب ہوں اور اس کے پرتکلف آراستہ و پیراستہ

کمروں میں کہیں طبلہ پر تھاپ پڑ رہی ہو، کہیں گھنگرو بج رہے ہوں اور کہیں ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں" کا ہنگامہ برپا ہو اور ان تمام خصوصیات کے باوجود آپ فرمائیں کہ یہ قصر رفیع الشان "شیخ حرم" کی رہائش گاہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ لامشاحۃ فی الاصطلاح کی آڑ لے کر آپ تسمیۃ الشئ باسم غیرہ کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ علاوہ ازیں آج پاسپورٹ اور ویزا کے جو قواعد وضوابط ہیں ان کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جو مسلمان حجاز مقدس جاتے ہیں، ان کو ویزا میں یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ وہاں کوئی ملازمت یا کاروبار نہ کریں گے۔ اور وہاں بھی شہری حقوق حاصل کرنے کے وہی قواعد وضوابط ہیں جو دوسرے ملکوں میں ہیں، ان امور کے پیش نظر دو حال سے خالی نہیں، اگر دارالاسلام کی تعریف اور اس کے خصوصیات اب بھی وہی ہیں جو فقہ کی کتابوں میں درج ہیں اور جن کی وجہ سے اسم اور مسمی میں مطابقت پیدا ہوتی ہے تو پھر بتانا ہوگا کہ ان اوصاف وخصائص کا حامل کون سا ملک ہے اور یا دارالاسلام کی کوئی نئی تعریف ایسی کرنی ہوگی جس کے ماتحت مسلمانوں کی اکثریت والے ملک دارالاسلام کہلا سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ باوجود ان تمام باتوں کے جن کا ذکر ابھی ہوا مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک جہاں مسلمان صدر مملکت ہے فقہا کے ان بیانات کی روشنی میں جنھیں ہم سابق میں نقل کر آئے ہیں دارالاسلام ہی ہیں، لیکن ان ممالک کی کیا خصوصیت ہے۔ ان بیانات کی رو سے تو ہندوستان اور دوسرے غیر مسلم اکثریت کے ملک جہاں مسلمانوں کی مذہبی آزادی مسلم ہے وہ بھی دارالاسلام قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ آپ پڑھ ہی آئے ہیں کہ برطانوی عہد کے ہندوستان کو کس کثرت سے علما نے دارالاسلام لکھا اور کہا ہی ہے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ چونکہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاح کہیں قرآن میں نہیں ہے اور عہد نبوت و عہد صحابہ میں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا، پھر قدیم مصنفین کی کتابوں میں عام طور پر بجائے دارالاسلام کے "دارنا" "ہمارا ملک" یا "ہمارا وطن" کے الفاظ ملتے ہیں[۱] علاوہ ازیں کتب فقہ میں دارالاسلام کے ساتھ "دارالمسلمین" کا لفظ بھی مستعمل ہوا ہے[۲] اور اس زمانہ میں بدقسمتی سے کوئی ملک ایسا نظر بھی نہیں آتا جس پر اسلام فخر

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جدید ایڈیشن جلد ۲ ص ۱۲۷۔
[۲] ملاحظہ کیجیے المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۱۱۴ باب المرتدین۔

Marfat.com

کرسکے اور جو (فقہا کے بیانات سے قطع نظر) صورۃً ومعنیً دارالاسلام ہو، اس بنا پر ہمارے زمانے میں شہریت اور قومیت یا جنسیت کا جو بین الاقوامی تصور قائم ہو گیا ہے اور جسے مسلم اور غیر مسلم سب ممالک نے اختیار کر لیا ہے ہم کیوں نہ اس کی روشنی میں دار کی ایک نئی قسم معین کریں۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مسلم اکثریت کے ممالک کا ذکر محض ضمناً آگیا ہے۔ ورنہ اس مقالہ کا اصل موضوعِ بحث ہندوستان ہے اور اسی سے ہمیں سروکار ہے۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ سب ہندوستانی مذہب اور زبان اور رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود دستوری اور آئینی طور پر ایک قوم (NATION) ہیں اور مسلمان بھی اس کا ایک جزو ہیں، چنانچہ پاسپورٹ، ویزا، شہری حقوق، قومی اور بین الاقوامی معاملات و مسائل۔ ان سب امور میں ان کے ساتھ جو معاملہ یا برتاؤ ہوتا ہے وہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے، ان کی یہ وہ حیثیت ہے جس کو خود انھوں نے تسلیم کیا ہے اور انٹرنیشنل لا کے ماتحت دنیا کی سب مسلم اور غیر مسلم حکومتوں اور قوموں نے کیا ہے۔ اس بنا پر ہندوستان کسی ایک مذہب یا گروہ کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا وطن (دار) ہے جو انڈین نیشنلٹی رکھتے اور انڈین نیشن کا جزو ہیں۔

ایک انسان کا دوسرے انسان سے یا ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے جو تعلق یا رابطہ (ASSOCIATION) ہوتا ہے وہ بہت سے دائروں میں تقسیم ہے اس سلسلے کا سب سے بڑا دائرہ وہ ہے جس میں ربط بر بنائے انسانیت ہوتا ہے، اس کے بعد مذہب اور پھر وطن کے دائرے ہیں۔ کسی دائرے کے بڑے ہونے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس سے چھوٹے دائروں سے زیادہ اہم ہے۔ البتہ ہر دائرہ کے حدود اور اس کے اپنے مقتضیات و مطالبات ہیں بہرحال انسانی علائق و روابط کے یہ دائرے طبعی اور فطری ہیں، اس بنا پر اسلام بھی انھیں تسلیم کرتا اور ان کے حدود اربعہ متعین کر کے ہر ایک کے واجبات و مطالبات کی تشخیص کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں پیغمبروں نے جگہ جگہ اپنے اہل وطن کو یا قومنا۔ یا قومی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان لوگوں کے لیے جن میں آپ مبعوث ہوئے قوم کہا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن میں امۃ کا لفظ بھی قوم کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

Marfat.com

وما من امة الا خلا فیه نذیر اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بھی مسلمانوں اور یہود سب کو امۃ واحدۃ فرمایا۔ پس جب اس وطنی اشتراک کو قرآن تسلیم کرتا ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے تسلیم کیا اور اس کی اساس پر آپؐ نے غیر مسلموں سے معاملات طے کیے اور ان لوگوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا اس بنا پر ہندوستان کی شرعی حیثیت یہاں کے مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ یہ ان کا الوطن القومی (NATIONAL HOME) ہے اور اس کے لیے جداگانہ احکام ہیں یوں تو اسلام کی تعلیمات کی رو سے دنیا کے سب انسانوں کے ساتھ ہی بِرّ و قسط اور احسان و کرم اور خدمت و اعانت کا معاملہ ہونا چاہیے۔ لیکن الاقرب فالاقرب کے ماتحت جو جتنا قریب ہے اتنا ہی اس کا حق ہے اسی بنا پر قرآن میں ذوی القربیٰ کو دوسرے مستحقین امداد و اعانت پر مقدم رکھا گیا ہے۔

قومی وطن ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس ملک کو ترقی دینے اور اسے مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں اُن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور جہاں کہیں ظلم و بے انصافی ہو اس کے خلاف آواز اٹھائیں اور عدل و احسان کے قیام اور منکر و فحشا سے اس ملک کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کے ذہن اور دماغ، ان کی صلاحیت ان کی دولت و ثروت اور ان کے اخلاق و کردار پر صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ اس ملک کے ہر مرد اور ہر عورت کا حق ہے۔ جس زمانہ میں مسلمانوں کی طاقت و قوت اور ان کی حکومت و سلطنت کا ڈنکا بجتا تھا اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کا عمل اصول فقہ کے اس مشہور اصول پر تھا:

المسلم والکافر فی مصائب الدنیا سواءٌ[۱] مسلمان اور غیر مسلم دنیوی حوادثات و مصائب میں برابر ہیں۔

اسلام میں شرک سے زیادہ مبغوض کوئی چیز نہیں، لیکن اس کے باوجود مشرک

---

[۱] THE MUSLIM CONDUCT OF STATE BY Dr. HAMIDULLAH P.71

کے متعلق بھی حکم یہ ہے کہ اگر وہ پناہ مانگے تو مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اُسے پناہ دے قرآن مجید میں ارشاد ہے :-

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ

اگر کوئی ایک مشرک بھی تجھ سے پناہ طلب کرے تو اس کو پناہ دے۔

پس جس مذہب کی تعلیمات یہ ہوں اس کے ماننے والوں کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ برادران وطن اور خود وطن کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہونا چاہیے۔

تمام شد

Marfat.com

تعارف

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں امام فخرالدین رازی (م ۶۰۶ھ) کی ایک تحریر کا مخطوطہ ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر نایاب ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود ابھی تک کسی اور کتاب خانے کی فہرست میں اس کا تذکرہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہت سے ارباب علم و تحقیق سے بھی دریافت کیا مگر کسی سے اس کا کچھ سراغ نہیں ملا۔ یہاں اس رسالے کا متن شائع کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے اسے دیکھنے کے بعد کوئی صاحب اس پر مزید روشنی ڈال سکیں۔

یہ مخطوطہ آزاد لائبریری کے ذخیرۂ سبحان اللہ خاں کی فہرست کے صفحہ ۱۲ نمبر ۷، ۹۲/۹ "تصوف" کے تحت درج ہے لیکن درحقیقت یہ تصوف کا رسالہ نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ امام عالی مقام کے ایک فرزند ارجمند کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ انھیں قدرتی طور پر سخت صدمہ ہوا۔ اس سلسلے میں کسی بادشاہِ وقت نے انھیں تعزیت نامہ لکھا۔ اس کے جواب میں امام صاحب نے جو خط لکھا تھا یہی تحریر وہ خط ہے۔ چنانچہ اس رسالے کے آغاز میں لکھا ہے:

> "ایں رسالہ ایست کہ مولانا شیخ الاسلام اعظم، علامۃ العلماء فی العالم، الامام الہمام والحبر القمقام فخرالدین محمد الرازی روح اللہ روحہ و رضی اللہ عنہ بہ بادشاہ آں زمانہ نوشتہ، درجواب تعزیت نامہ کہ ملک بر وفات پسر امام نوشتہ بود۔"

یہ رسالہ نو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں پندرہ سطریں ہیں۔ اس پر نہ کاتب کا نام ہے اور نہ سنہ کتابت درج ہے اور نہ اس شخص کا نام ہے جو اس کا جامع ہے اور جس نے ظاہراً سطور بالا لکھی ہیں۔

Marfat.com

لیکن کاغذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو ڈھائی سو برس کا نوشتہ ہوگا۔ اگرچہ یہ مختصر رسالہ کہنے کو صرف ایک تعزیت نامہ کا جواب ہے لیکن درحقیقت اس میں زندگی اور موت کا فلسفہ بالکل اچھوتے اور نئے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارباب علم جانتے ہیں کہ امام رازی عام طور پر بلند پایہ فلسفی اور منطقی کی حیثیت سے اس درجہ مشہور ہیں کہ مولانا جلال الدین رومی کو بھی امام صاحب کے "راز دار دین" ہونے میں شبہ ہے لیکن اصل یہ ہے کہ امام صاحب کو اپنی عمر کے اخیر دور میں تصوف اور مسائل طریقت و معرفت سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ علامہ سبکی انھیں اہل دین اور اہل تصوف میں سے ملنتے ہیں[1]

فلسفے کے ساتھ تصوف اور علوم شریعت کے ساتھ اسرار و رموز طریقت کی آمیزش ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ امام صاحب اخیر زمانہ میں بڑی پابندی سے وعظ کہنے لگے تھے اور ان کا وعظ اس درجہ موثر اور رقت انگیز ہوتا تھا کہ شہاب الدین غوری کے سے بادشاہ پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور وہ زار و قطار رونے لگتا تھا[2]۔ چنانچہ اس رسالے میں بھی فلسفے اور تصوف دونوں کی آمیزش و ترکیب پائی جاتی ہے اور اس بنا پر اس کا مخصوص اسلوبِ بیان و طریقِ استدلال صاف بتا رہا ہے کہ یہ امام صاحب کے سوا کسی اور کی تحریر نہیں ہو سکتی۔

یہ رسالہ حسب ذیل دس فصلوں پر مشتمل ہے:

(۱) در مثال روح انسانی۔ (۲) در فنائے ایں جثہ (۳) در اثباتِ حقیقتِ روح انسانی (۴) در حقیقتِ مرگ و احوالِ آں۔ (۵) در بیانِ دردِ فراق (۶) در بیان نصیحت و تنبیہ۔ (۷) در مراتبِ ارواحِ انسانی (۸) در بیانِ حکمتِ مرگ و دلائلِ آں۔ (۹) در حقیقت زیارت کیفیت تجلی ارواح۔ آخری یعنی دسویں فصل میں امام صاحب نے اپنے ذاتی رنج و الم کا ذکر کیا ہے جو انہیں بیٹے کی جوانمرگی کے باعث اٹھانا پڑا ہے۔

اس سلسلے میں تین باتیں خاص طور پر تحقیق طلب ہیں:

(الف) امام صاحب کے اس صاحبزادے کا نام کیا تھا اور اس کا انتقال کب ہوا؟

---

[1] طبقات الشافعیہ، ۵ : ۳۵

[2] بدایونی: منتخب التواریخ: ۱ : ۱۶

Marfat.com

(ب) جس بادشاہ نے امام صاحب کو تعزیت نامہ لکھا تھا، وہ کون تھا؟

(ج) اس رسالے کا نام کیا ہے اور امام صاحب کی تالیفات میں کہیں اور اس کا سراغ ملتا ہے یا نہیں؟

(الف) امام صاحب کی اولاد کی صحیح تعداد ہمیں معلوم نہیں، البتہ اتنا ثابت ہے کہ ان کے تین صاحبزادے تو ضرور تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: ضیاء الدین، شمس الدین، محمد۔ ضیاء الدین سب سے بڑے تھے اور علمی مشغلہ رکھتے تھے[3]۔ شمس الدین جن کی کنیت ابوبکر تھی، سب سے چھوٹے تھے۔ امام صاحب نے وصیت نامے میں انھیں کے متعلق لکھا ہے کہ اس بچے میں ذہانت اور طباعی کے آثار نمایاں ہیں اس لیے تعلیم و تربیت میں کافی اہتمام کیا جائے[4]۔

اب رہے تیسرے محمد، تو یہ وہی ہیں جن کے ساتھ امام صاحب کو غیر معمولی محبت و نسبت تھی اور جوانی ہی میں باپ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کا انتقال ۶۰۰ھ کے اوائل میں ہوا ہوگا۔ کیونکہ خود امام صاحب تفسیر کبیر میں سورۂ یونس کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں:

"میں نے اس سورۃ کو ہفتہ کے دن رجب ۶۰۰ھ میں ختم کیا۔ حالانکہ میں اپنے فرزند صالح محمد کی موت کے باعث بڑا ملول اور دل گرفتہ تھا[5]۔"

امام صاحب کو محمد کی جوانامرگی کا صدمہ اس درجہ تھا کہ اس حادثے پر ایک برس سے بھی زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود جب انھوں نے شعبان ۶۰۱ھ میں سورۂ یوسف کی تفسیر سے فراغت پائی تو بیٹے کی جدائی کا غم اچانک دماغ میں تازہ ہو گیا اور چند آنسو مرثیہ کے اشعار کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر ٹپک پڑے۔ امام صاحب کے لیے یہ غم کس درجہ جانگداز تھا، اس کا کچھ اندازہ مرثیۂ مذکورہ کے اس شعر سے ہوتا ہے:

واقسم ان مسوا رُفاتی و رمّتی   احسوا بنار الحزن فی مکمن العظم

(بخدا! اگر لوگ میری بوسیدہ ہڈیوں کو بھی ٹٹولیں گے، تو غم کی آگ ان ہڈیوں کے نہاں خانے میں محسوس کریں گے)[6]

---

[3] عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ۲: ۲۶
[4] ایضاً، ۲: ۲۸
[5] تفسیر کبیر: ۵: ۳۴۴
[6] ایضاً، ۵: ۱۷۵

اس کے بعد سورۂ رعد کی تفسیر ختم کرتے کرتے یہ سلگتی آگ پھر بھڑک اٹھی، تو اس موقع پر بھی مرثیے کے دو شعر بے ساختہ قلم کی زبان پر آگئے ہیں۔

غرض اس میں شبہ نہیں کہ امام صاحب کو جس بیٹے کی جوانمرگی کا غم اٹھانا پڑا، اس کا نام محمد تھا۔ چنانچہ مخطوطۂ تفسیر کی آخری فصل جس میں انھوں نے اپنے طبعی حزن وملال کا اظہار عجیب وارفتگی کے ساتھ کیا ہے اس میں بھی یہی نام مذکور ہے۔ عام قرینہ یہ ہے کہ یہ اپنے بھائیوں میں عمر میں سب سے چھوٹے ہوں گے۔ مفتاح السعادۃ میں اس کی تصریح بھی موجود ہے: ومات محمد فی عنفوان شبابہ[۸]۔ لیکن اڈورڈ فنڈیک نے معلوم نہیں کس بنیاد پر محمد کو امام صاحب کی اولاد میں سب سے بڑا بتایا ہے[۹]۔

(ب) اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ امام صاحب کے تعلقات اپنے زمانے کے متعدد بادشاہوں اور فرمانرواؤں کے ساتھ بہت گہرے اور عزیزانہ تھے۔ شہاب الدین غوری کے ساتھ تو اس درجہ کا تعلق تھا کہ ایک مرتبہ اسے ضرورت ہوئی تو اس نے امام صاحب سے روپیہ قرض لیا[۱۰]۔ امام صاحب خاص محلِ شاہی میں وعظ بھی کہتے تھے۔ ایک مرتبہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ اثنائے وعظ میں شہاب الدین غوری کو خطاب کر کے فرمایا: "اے بادشاہ! ایک وقت آئے گا، جب نہ تیری بادشاہی رہے گی اور نہ رازی کی یہ روباہ گری؛ اور ہم سب کو اللہ کے حضور میں پہنچنا ہوگا۔" غوری پر ان فقروں کا اتنا اثر ہوا اور وہ دیر تک اس طرح روتا رہا کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا[۱۱]۔ ملا عبدالقادر بدایونی اور دوسرے حضرات نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ لیکن ملا صاحب نے اس پر اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ امام صاحب کا یہ وعظ ہر ہفتے ہوتا تھا اور بادشاہ امام صاحب کے پیروں کی جانب بیٹھتا تھا[۱۲]۔ شہاب الدین غوری کی طرح امام صاحب کے تعلقات اس کے بھائی ابو الفتح غیاث الدین غوری کے ساتھ بھی بہت گہرے تھے۔ شروع شروع میں غیاث الدین غوری پر فرقۂ کرامیہ کے اثرات تھے

---

۸ مفتاح السعادۃ، ۱: ۵۱

۹ اکتفاء القنوع بما ہو مطبوع: ۱۹۷

۱۰ تاریخ ابن خلکان، ۱: ۵۰۴

۱۱ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ، ۲: ۶۸۳

۱۲ منتخب التواریخ، ۱: ۱۶

Marfat.com

لیکن امام صاحب کے قرب و اتصال کے باعث اخیر میں وہ شافعی المذہب اور علما و صلحا کا بڑا قدر داں ہوگیا۔ اس نے مسجدیں اور سرائیں تعمیر کرائیں اور بڑے بڑے کار ہائے خیر سرانجام دیے۔ اس نیکی اور خلق نوازی کے باعث امام صاحب کو بھی اس کے ساتھ اس درجہ کا تعلق پیدا ہوگیا کہ انھوں نے لطائف الغیاثیہ اور بعض اور کتابیں بھی اسی کے نام معنون کی ہیں۔[۱۲]

غوری خاندان کے ان دو بادشاہوں کے علاوہ امام صاحب کے مراسم اور تعلقات خوارزم شاہی خاندان کے دو بادشاہوں علاءالدین تکش اور اس کے بیٹے محمد بن تکش سے بھی تھے۔ چنانچہ شروع میں علاءالدین تکش نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے امام صاحب ہی کو مقرر کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ امام صاحب کو یہ تعزیت نامہ کس بادشاہ نے لکھا تھا؟ ہمارا خیال ہے کہ یہ ملک محمد تکش ہے، جو عام طور پر خوارزم شاہ کے لقب سے معروف ہے۔ امام صاحب کے صاحبزادے محمد کا انتقال ہمارا قیاس ہے ۶۰۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس صورت میں علاءالدین تکش اور غیاث الدین غوری تو اس تعزیت نامہ کے مصنف اس لیے نہیں ہو سکتے کہ اول الذکر کا انتقال ۵۹۶ھ میں ہوا اور موخرالذکر کا ۲۷ رجمادی الاولیٰ ۵۹۹ھ کو۔[۱۳] رہا شہاب الدین غوری، تو اگرچہ اس کے قتل کا واقعہ ۶۰۲ھ میں پیش آیا ہے لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شہاب الدین غوری لشکر لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ پھر رہا تھا۔ ۵۹۹ھ میں وہ غزنیں سے خراسان کی طرف روانہ ہوا۔ راہ میں بھائی کے انتقال کی خبر ملی تو بادغیس جا پہنچا، اور بھائی کی مملکت اپنے بھتیجوں اور بھانجوں میں تقسیم کی۔ یہاں سے فارغ ہوا تو خوارزم کا رُخ کیا اور اسے فتح کرنے کے خیال سے شہر کا محاصرہ کیے پڑا رہا یہاں تک کہ جنگ ہوئی جس میں دونوں فریق کا بہت نقصان ہوا۔ اس کے بعد وہ دریائے جیحوں کے کنارے کنارے بلخ کے ارادے سے جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں ترک اور خطا کے لشکر سے مڈبھیڑ ہوگئی جس میں اسے عظیم خسارہ برداشت کر کے اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ میدان چھوڑنا پڑا۔[۱۴] غرض کہ ۵۹۹ھ سے ۶۰۱ھ تک کے دو برس شہاب الدین غوری کے ایسی پریشانی اور سراسیمگی میں گزرے کہ ان حالات میں اس کا امام صاحب کو تعزیت کا خط لکھنا محال نظر آتا ہے! اب لے دے کے ایک

---

[۱۲] منتخب التواریخ ۱: ۱۶

[۱۳] طفر الوالہ، ۲: ۶۷۵

[۱۴] جوزجانی بحوالہ ظفر الوالہ، ۲: ۶۸۱

خوارزم شاہ یعنی محمد بن تکش رہ جاتا ہے جس نے اپنے باپ کی وفات (۵۹۹ھ) کے بعد اکیس برس تک بڑے جاہ و جلال اور طنطنے کے ساتھ حکومت کی۔ جیسا کہ بیان ہوا اسے امام صاحب سے شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا اور امام صاحب کے غیر معمولی فضل و کمال اور جلالتِ علم کے باعث وہ ان کا اتنا قدردان تھا کہ ابن خلکان کا بیان ہے:[۱۵]

اتصل بالسلطان محمد بن تکش المعروف بخوارزم شاہ فحظی عندہ ونال اسنی المراتب ولم یبلغ احد منزلتہ عندہ	امام رازی سلطان محمد تکش معروف بہ خوارزم شاہ سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے اور سلطان کے نزدیک جو مرتبہ و مقام آپ کا تھا۔ وہ کسی دوسرے کو میسر نہیں ہوا۔

امام رازی کا بھائی رکن الدین انھیں بہت پریشان کرتا رہتا تھا۔ امام نے اس کا تذکرہ سلطان سے کیا تو اس نے رکن الدین کی نقل و حرکت ایک مختصر علاقے میں محدود کر دی اور اس کی بسر اوقات کے لیے ایک جائداد مقرر کر دی جس کی آمدنی ایک ہزار دینار سالانہ تھی۔[۱۶] سلطان اگرچہ بہت وسیع المملکت اور بڑے دبدبے کا حکمران تھا لیکن اس کی امام صاحب سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔[۱۷] امام صاحب کو بھی اس سے ایسا گہرا لگاؤ اور تعلق تھا کہ وفات سے قبل انھوں نے جو وصیت نامہ لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں: "میں اپنے بچوں کو پہلے اللہ کے اور پھر اللہ کے خلیفہ محمد (یعنی سلطان محمد بن تکش) کے حوالے کرتا ہوں"۔[۱۸] سلطان شہاب الدین غوری اور سلطان محمد بن تکش خوارزم شاہ میں سخت جنگ اور خونریزی کے بعد صلح صفائی ہو گئی تھی۔ مورخین کا عام خیال ہے کہ یہ بھی دونوں پر امام صاحب کے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے ہوئی۔ ان قرائن سے پتا چلتا ہے کہ امام صاحب کے نام جس بادشاہ نے تعزیت نامہ لکھا تھا وہ یہی سلطان محمد بن تکش المعروف بخوارزم شاہ (م ۶۱۶ھ) ہے۔

اب صرف ایک سوال رہ گیا کہ اس رسالے کا نام کیا ہے؟ اور کیا امام صاحب کی کسی دوسری تالیف میں کہیں اس کا سراغ ملتا ہے یا نہیں؟ ابن ابی اصیبعہ نے امام صاحب کی تالیفات و تصنیفات

---

[۱۵] تاریخ ابن خلکان، ۱: ۴۷۵

[۱۶] عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ۲: ۲۵

[۱۷] ایضاً، ۲: ۲۳

[۱۸] ایضاً، ۲: ۲۹

Marfat.com

کے جو نام گنائے ہیں ان میں ایک تصنیف کا نام نفثۃ المصدور ہے[۱۹] جسے ہم "آہِ غم" کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اور دوسرے مورخوں نے امام کی تالیفات کے ضمن میں اس رسالہ کا نام نہیں لیا، لیکن ابن ابی اصیبعۃ (م ۶۶۸ھ) دوسروں کی بہ نسبت امام صاحب سے زیادہ قریب العہد ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے امام کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور اس سلسلے میں بعد کے مورخوں کے لیے ماخذ بھی اغلباً وہی ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بیان کو درست نہ قرار دیا جائے۔

لیکن ابن ابی اصیبعہ نے بھی رسالے کا صرف نام لکھا ہے، یہ نہیں بتایا ہے کہ اس کا موضوع کیا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس رسالے کو امام صاحب کی تالیفات میں گنوایا تو ہے، لیکن ساتھ ہی لکھتے ہیں "معلوم نہیں کہ کس موضوع پر ہے"[۲۰]

قیاس کہتا ہے کہ قاضی ابن اصیبعہ نے جس رسالے کا نام نفثۃ المصدور لکھا ہے وہ یہی رسالہ زیر بحث ہے۔ اس کا ثبوت اول تو خود اس رسالے کا مضمون اور موضوع ہے، جو اس کے عنوان کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ امام سے پہلے (اور ان کے بعد بھی) جب بھی کسی صاحبِ علم و قلم نے کسی اندوہناک واقعہ سے متاثر ہو کر کوئی بڑی کتاب لکھی ہے، تو اس کا نام کلاً یا جزاً عام طور پر نفثۃ المصدور ہی رکھا ہے۔ چنانچہ حاجی خلیفہ نے اس نام کے دو رسالوں کا ذکر کیا ہے[۲۱] جن میں سے ایک شیخ قطب الدین ابو الحسن سعید بن ہبۃ اللہ الراوندی (م ۵۷۳ھ) سے منسوب ہے اور دوسرا اشرف الدین انوشرواں بن خالد سے، جو سلطان طغرل سلجوقی کا وزیر تھا جیسا کہ حاجی خلیفہ نے تصریح کی ہے، یہ کوئی مستقل کتاب نہیں تھی بلکہ شیخ صدرالدین بن اسحٰق القونوی کی کتاب کا خلاصہ تھی۔ عہد حاضر میں ایران کے ایک فاضل شیخ عباس محمد رضا قمی نے جب ایک رسالہ مقتل کے موضوع پر لکھا تھا تو اس کا نام بھی نفثۃ المصدور رکھا[۲۲]۔ اس سے قیاس کو تقویت پہنچتی ہے اور گمان قریب بہ یقین ہے کہ یہ مخطوطہ امام رازی کا رسالہ نفثۃ المصدور

[۱۹] عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ۲: ۳۰

[۲۰] امام رازی: ۴۵ (غالباً سہو کتابت سے ان کے ہاں کتاب کا نام "نفثۃ" (بجالثا) کے بجائے "نفسہ" سین سے لکھا گیا ہے)

[۲۱] کشف الظنون۔ ۲: ۶۰۸

[۲۲] رضوی: فہرست کتاب خانۂ آستانۂ قدس، ۵: ۳۴۰

آخر میں بجا طور پر یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ رسالہ واقعی امام رازی کا چکیدۂ قلم ہے، تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ خود اس رسالے میں امام موصوف کے نام کی تصریح موجود ہے اور آخر میں ان کے مرحوم بیٹے کا نام محمد بھی درج ہے اور یہ بھی مذکور ہے کہ اس حادثے پر ایک بادشاہ نے انھیں تعزیت کا ایک خط لکھا تھا۔ اور امام صاحب سے سلاطین وقت کے ذاتی اور نجی تعلقات ایک تاریخی حقیقت ہیں۔ اس کے علاوہ امام صاحب کی ایک کتاب فارسی زبان میں "ستینی" المعروف بہ جامع العلوم ہے، جو جناب مستطاب مقرب الخاقان خاں صاحب میرزا محمد خاں ملک الکتاب کی کوشش اور اہتمام سے ۱۳۲۳ھ میں بمبئی کے مطبع مظفری میں چھپی تھی۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، اس میں ساٹھ علوم و فنون سے متعلق امام صاحب کے چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ اس کتاب کی زبان اور انداز بیان اور طریق بحث و استدلال اور اسلوب گفتگو بالکل وہی ہے جو ہمارے زیر بحث مخطوطہ میں ملتا ہے یعنی زبان سادہ ہے، بات مختصر اور طریق بیان مقدمات اور اصول پر منقسم ہونے کے باعث منطق و فلسفہ کا پیرایہ لیے ہوئے!

یہ مخطوطہ کب لکھا گیا؟ کس نے لکھا؟ اور کس مخطوطے سے منقول ہے؟ اور اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور قدیم تر مخطوطہ کب لکھا گیا؟ اور وہ کہاں ہے؟ افسوس کہ پوری کوشش کے باوجود ابھی تک اس گتھی کے سلجھانے کا کوئی سامان پیدا نہیں ہوا۔ یہ رسالہ اسی امید پر جوں کا توں شائع کیا جا رہا ہے کہ شاید کوئی محقق اس سلسلے میں مزید معلومات بہم پہنچا سکیں۔[۲۳]

سعید احمد اکبر آبادی

---

۲۳ یہاں مجھے مولانا سید سبط حسن صاحب اورینٹل اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن سے مخطوطات کی مختلف فہرستوں سے مراجعت اور بعض معلومات فراہم کرنے میں بڑی مدد ملی

Marfat.com

نفثۃ المصدور

اور

ہندوستان کی شرعی حیثیت

سعید احمد اکبر آبادی
صدر شعبۂ سُنّی دینیات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

متن نفثة المصدور

Marfat.com

Marfat.com

فصلِ اوّل

در مثالِ روحِ انسانی

بر سبیلِ اجمال، مرد چوں در کشتی بنشیند و کشتی نزدیک کرانۂ دریا باشد، چناں بیند کہ کشتی ساکن ست و آبِ دریا متحرک، و ایں غلط ست، زیرا کہ کشتی متحرک ست و کرانۂ دریا ساکن۔ روحِ انسانی را در کشتیِ تن نشاند و آن کشتی در دنیا انداخت۔[۱] مردمی پندارند کہ کشتیِ تن ساکن ست و دریاے روزگار در حرکت، و آں غلط ست، زیرا کہ کشتیِ حیاتِ جسمانی کہ بواسطۂ جسد حاصل شود، در حرکت ست، و دریاے ادوارِ روزگار بحالِ خود باقی۔ پس کشتی را کہ قوتِ بصیرت بحدے تر شد کہ چیزہا چنانچہ باشد، بیند، از تغیرِ احوالِ روزگار برنجد، و ازیں جہت ست کہ مہتر و بہترِ عالم صلوٰت اللہ و سلامہ علیہ فرمودہ: "ارنا الاشیاء کما ھی" یعنی مرا بنما چیزہا را چنانکہ آن چیزہاست۔ واللہ ولی التوفیق۔

فصلِ دوم

در فناے ایں جثّہ

مشاہدِ ایں تن را از براے بقا نیافریدہ اند زیرا کہ بچشم می بینم کہ او از حالے بحالے می گردد۔ کودک بود، جواں شد؛ جواں بود، پیر شد۔ پس اگر بر یک حال قرار گرفتہ بودے، باقی بودے۔ چوں بر یک حال قرار نگرفت، معلوم شد کہ او را از براے بقا نیافریدہ اند۔ پس ہر کہ از وے طمعِ بقا دارد، چوں نیابد، برنجد و بحقیقت او را از خود باید رنجید کہ چرا از ناپائندہ پائندگی طمع داشت۔

فصلِ سوم

در اثباتِ حقیقتِ روحِ انسانی

تا مرا حقیقتِ خود را از مرگ فراغت حاصل نشود، بباید دانست که تو دیگری و تنِ تو دیگر و دلائلِ این سخن بسیارست:

دلیل اوّل: آنست که آدمی در بزرگی ہمانست که در کودکی بود، زیرا که من ہمان کسم که مادر مرا بزاد، و کودک بودم، جوان شدم وامروز پیر شدم، لیکن آں وقت که کودک بودم، یک من یا بیشتر یا کمتر، وامروز پنجاہ من باشم یا بیشتر یا کمتر۔ پس اجزاے بدن کم وبیش می شود و من در ہمہ حال یک چیز بودم۔ پس معلوم شد که حقیقتِ من چیزے دیگرست، غیر ایں جثّہ وجسد۔

دلیل دوم: آنکه مرد چوں تندرست باشد، فربہ شود، چوں بیمار شود، لاغر گردد۔ باز چوں تندرست گردد، فربہ شود۔ و ایں مرد در ہمہ حال ہماں کس بود که بود۔ چوں اجزاے تن مبدل می شود، حقیقتِ او باقیست۔ پس ہر آئینہ حقیقتِ او غیر ایں جثّہ وجسد باشد۔

دلیل سوم: مرد در وقتِ بیداری اگر خواہد که عالمِ غیب را مطالعہ کند، نتواند۔ چوں بخواب رود، مطالعہ غیب او را میسر شود و بیداری سبب قوّتِ تن ست۔ پس پیدا شد که در وقتِ بیداری که سببِ قوتِ تن ست، روح ضعیف ست، و از مطالعۂ عالمِ غیب عاجز۔ و در وقتِ خواب که سببِ ضعفِ تن ست و قوتِ روح، بر مطالعہ غیب قادر می شود۔ پس پیدا شد که در وقتِ قوتِ تن، روح ضعیف ست؛ و در وقتِ ضعفِ تن، روح قوت می گیرد۔ پس معلوم شد که روح [که] محلِ علم و فہم و معرفتِ حق است، چیزے دیگرست غیر ایں جُثّہ وجسد۔

دلیل چہارم: اندیشہ کردن بسیار در معرفت سبب کمالِ روح ست، زیرا که از اندیشۂ بسیار روح از تاریکیِ نادانی بنورِ معرفتِ حق می رسد، و سعیدِ ابدی شود۔ و اندیشہ سبب نقصانِ تن ست، زیرا که چوں مرد با اندیشۂ بسیار مشغول شود۔ از خوردن و خفتن و لذّات و شہوات محروم گردد و ضعف و یبوست بر تنِ او غالب شود۔ امّا بسیار خوردن و بلذات و شہواتِ دنیا مشغول شدن کمالِ تن ست، زیرا که تن فربہ شود و قوت گیرد، و آں قوت سببِ نقصانِ روح

ست، و بداں کہ ہرکس [کہ] غایت کارِ وے خوردن و شہوت راندن ست، از ستوراں باشد، و عاقلاں اُو را از بہائم شمرند، و بنظر حقارت در وَے نگرند. پس چوں ہر چہ سبب زیادتی تن ست آں چیز موجب نقصانِ روح ست، معلوم شد کہ روح کہ محلِ معرفت و محبت حق است، غیر ایں بدن ست۔

دلیل پنجم: آں کہ خاصیت عالم اجسام آنست کہ بر لوحے کہ در وَے نقشے نوشتہ شود، آں لوح نقشے دیگر قبول نکند؛ و اگر دو نقش بر لوحے نگاشتہ شود، ہر دو بیک دیگر آمیختہ شوند و ہر دو باطل گردد. بخلافِ لوحِ نقشِ انسانی کہ ہر چند نقش علوم و معارف دراں نگاشتہ شود ہیچ یک از آنہا بدیگرے آمیختہ نشود و باطل نگردد، زیرا کہ مرد باشد کہ از بیست علم از ہر یک او را مجلدہا یاد باشد و با ایں ہمہ صورتِ جملہ آسمانہا و سیر سیارگان و صورت دریا و کوہہا و شہرہا در خاطرِ او باشد و احوال و صفات معادن و نبات و حیوان در خاطر او جمع شدہ باشد و ایں ہمہ نقشہا صافی باشد، و ہیچ یک از آنہا بدیگرے آمیختہ نمیشود۔ پس پیدا شد کہ ہر چہ جسم بود، جز یک نقش قبول نہ کند و روح انسانی نقشہائے بے غایت و صورتہائے بے نہایت قبول می کند، و ہیچ یک از انہا بدیگرے آمیختہ نمی شود۔ پس معلوم شد کہ جوہر روح دانا چیزے دیگرے ست، غیرِ جسم ظلمانی پُر کدورت۔

دلیل ششم: آنست کہ مرتبہائے عمر آدمی چہار ست؛ اول زیادہ شدن و آنرا سن نشو و نما گویند و غایت آں تا سی سال باشد۔ دوم، استادن کہ نہ زیادہ شود و نہ نقصان پذیرد، و آں را سنِ شباب گویند؛ و غایت آں تا چہل سال باشد۔ سوئم، نقصانِ اندک۔ مردم دریں مدت کہل باشند؛ و غایتِ آں تا شصت سال بود۔ چہارم، نقصانِ بسیار، و مردم دریں اوقات مردِ ضعیف باشد؛ و غایتِ آں مرگ باشد۔ و عاقلاں گفتہ اند کہ آدمی در وقتِ نشو و نما چوں بہار ست؛ طبع او گرم و تر باشد؛ و در جوانی چوں تابستان ست طبعش گرم خشک بود؛ و در کہولت چوں خزاں باشد سرد و خشک؛ و در پیری چوں زمستاں شود سرد و تر۔ چوں ایں مقدمہ معلوم شد، گوئیم، مرد چوں بچہل رسد، تن و جسد او در نقصان و ضعف افتد۔ لیکن کمالِ عقلِ او دریں وقت پیدا شود؛ ازیں جہت ست کہ سرورِ کائنات و مفخر موجودات علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات بعد از چہل سال بخلعتِ وحی سرفراز گشت۔ پس معلوم شد کہ کارِ عالم روحانی برخلافِ کارِ عالم

Marfat.com

جسمانی ست. و ہر چہ موجبِ ضعف و نقصان یکے ست، کمال و سعادتِ دیگرے می شود۔

دلیل هفتم: کسانیکہ در دریاے معرفت خوض کنند، و دلِ ایشاں لذتِ معرفت و محبتِ حق دریابد، و بر قبائح و فضائحِ عالم جسمانی وقوفِ شاں افتد، درآں وقت از خوردن و خفتن باز ماند و باشد کہ روزہا بگزرد و اندک طعامے خورند۔ پس معلوم شد کہ عالم روحانی دیگر ست و عالم جسمانی دیگر

دلیل هشتم: عقل ہمہ کس گواہی می دہد کہ عالم جسمانی خسیس ست و عالمِ روحانی شریف و نفیس زیرا کہ ہرگاہ کہ در بارۂ شخص اعتقادے دارند کہ اورا بخوردن و خفتن و شہوت راندن رغبتے نیست واز طلبِ ایں معانی دور است، جملہ خلائق اورا خدمت کنند و فرمانبرداری نمایند۔ و ہرگاہ کہ در شانِ شخصے اعتقادے دارند کہ ہمگی رغبتِ او در خفتن و خوردن و شہوت راندن است، ہمہ کس اورا بچشم حقارت بینند و اورا از بہائم دانند۔ پس معلوم شد کہ ہمہ عقلہا گواہی می دہند کہ ہر چہ تعلق بعالم تن دارد، شقاوت و عینِ نقصان ست و سعادت و کمالِ حقیقی جز سعادت و کمالاتِ روحانی نیست۔

دلیل نهم: آنکہ حقیقت آدمی چیزیست کہ دانا و گویا و متذکر و متفکر باشد و ایں ہمہ صفات در وے جمع آید و در تن ہیچ عضوے نیست کہ ایں ہمہ صفات در وے جمع باشد، زیرا چشم بینائی دارد، امّا شنوائی و گویائی و دانائی ندارد، و زبان گویائی دارد، و دیگر صفتہا ندارد، و دماغ تفکر و تخیل دارد، امّا بینائی و شنوائی ندارد؛ و دل دانائی دارد، امّا دیگر صفتہا ندارد۔ پس پیدا شد کہ ہیچ عضوے در تن نیست کہ ایں صفتہا در وے جمع شدہ۔ پس معلوم شد کہ حقیقتِ آدمی چیزے دیگر ست غیر ایں اعضا و اجزا۔

دلیل دهم: آنست کہ ہمہ اعضا ملکِ انسان است۔ خداے تعالیٰ در صفت کافراں فرمودہ: لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا یعنی ایشاں را دلیست کہ بداں دل ہیچ فہم نکنند وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا و ایشاں را چشمہاست کہ بداں ہیچ نہ بینند کہ ایں ہمہ اعضا ملکِ انسان ست۔ و عقلا نیز چنیں می گویند، چنانکہ گویند: "دل من، و چشم من، و گوش من، و دست و پاے من، و عقل من" پس معلوم شد کہ ایں ہمہ اعضا ملکِ انسان است و ہر آئینہ مالک غیرِ مملوک باشد پس پیدا شد کہ حقیقتِ انسان چیزے دیگر ست، غیرِ ایں تنِ ظلمانی و اجزائے جسمانی۔

دلیل یازدهم: آنکه تن آدمی از خون و صفرا و بلغم و سودا پدید آمده است، و این همه پلید و تاریک و کثیف اند و معرفت و محبتِ حق جل و علا نور همه نورها ست، و پاک و مطهر و از آلائش مبرّا و مقدس پس ممکن نباشد که محلِ نورِ همه نورها اجسامِ پلید و کثیف باشند. پس معلوم شد که محلِ معرفت و محبتِ باری تعالیٰ از بدن خارج است۔

سوال: اگر سائلے گوید، "چوں می گوئی که روح انسانی و نفسِ ناطقه چیزے دیگر یست غیر تن، پس هما ناجزو لیست از خدائے عزّ وجل" جواب گوئیم: "حاشا و کلّا این گمانے باطل است۔ چه این کسے می پندارد که آفریدہاے خدائے تعالیٰ غیر ازیں اجسامِ تاریک [و] کثیف نیست و این خطاے بزرگ است؛ بلکه آفریدہاے خدائے تعالیٰ دو قسم اند، یکے عالمِ اجسام و اشرف مراتب آں عرش است، پس کرسی، پس اطباق سموات، بعد ازاں بنیت انسان، آن گاه حیوان، آن گاه نبات، آن گاه جماد۔ قسم دوم عالمِ ارواح و اشرف آں ملائکه اند که حاملانِ عرش پروردگار اند وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ[۵] آن گاه آن ملائکه که گرد عرش فرو گرفته اند وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ[۶] و هم چنیں بترتیب فرو می آید تا بارواحِ انسانی۔ پس معلوم شد که هم عالمِ اجسام و هم عالمِ ارواح مخلوق و پدید آوردهٔ آفریدگار اند۔ و ذاتِ قدیم بے نهایت حق جل و علا از جزو و بعض و قسمت مقدس و منزه است لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ" و دریں مقام اندکے از حقیقتِ روحِ انسانی معلوم شد واللّٰه الهادی۔

فصلِ چهارم

در حقیقتِ مرگ و احوالِ آن

چوں حقیقتِ روح معلوم شد، بحقیقتِ مرگ باز آئیم۔ پس گوئیم: درست کردیم بدلیلهاے روشن که جوهرِ روحِ انسانی در هستیِ خویش مستغنی ست از وجودِ ایں جسد، و ایں جسد اُو را آلتے هست که بواسطهٔ آں اسبابِ سعادت کسب کُند۔ لیکن روح چوں فاعلے باشد و او را در بعضے احوال آلتے بود که اگر آن آلت شکسته شود، ذاتِ فاعل باطل شود، بلکه از کار کردن باز ماند، و هم چنیں خون که آلتِ نفسِ ناطقه ست، فاسد گردد؛ در ذاتِ نفس تغیّرے و قصورے پدید نیاید، بلکه ذات او بحالِ خود باقی باشد۔

Marfat.com

الّا آنکہ اگر بدیں آلت دوستیِ عالمِ آخرت حاصل کردہ باشد، چوں نفس از دارِ دشمن خلاص یافت و بدوست رسید، لاجرم او را سعادت برسعادت حاصل باشد۔ و اگر بداں آلت دوستی دنیا و مال و جاہ و لذات و شہواتِ جسمانی حاصل کردہ باشد، چوں بمیرد از دوست دُور ماند و در شہر غریبستان بے یار و بیکس گرفتار شود۔ لاجرم غم بر غمش بیفزاید۔ و بر عاقلے کہ دریں فصل تامّل کند و توفیق ربانی ہمراہ او شود، واقعۂ حالِ خود را بعد از مرگ دریں زندگانی معلوم کند و حقیقت آں را بذوق دریابد۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ۔

فصلِ پنجم

در حقیقتِ دردِ فراق

بداں کہ حقیقتِ دردِ فراق جدا ماندنِ کسے ست از چیزے کہ دوست دارد۔ پس از وے جدا ماندن درد باشد۔ مثلاً ہیچ درد سخت تر از درد آتش سوختن نیست۔ زیرا کہ طبیعت ہر جزو از اجزائے تن تقاضائے آں کند کہ بجزوِ دیگر پیوستہ باشد۔ آں پیوستگی معشوق و محبوب اوست، و آتش چیزے گرم و لطیف ست بمیانِ اجزا درآید و آں را از یک دیگر جدا گرداند۔ پس دردے کہ پدید آید بسبب تفرق اجزائے بدن از یک دیگر باشد۔ پس معلوم شد کہ دردِ سوختنِ آتش دردِ جدائی است و بداں کہ زخم تیغ در ہمہ اعضا جدائی پدید نیارد۔ امّا آتش در ہمہ اعضا جدائی پدید آرد۔ لاجرم دردے کہ از تیغ باشد سہل تر بود۔ پس معلوم شد حقیقتِ درد جدا ماندن ست از دوست۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم

فصلِ ششم

دربیان نصیحت و تنبیہ

چوں معلوم شد کہ حقیقتِ درد جدا ماندنست از دوست، پس باید کہ مردِ عاقل بکوشد تا ہر چہ خطرِ آں دارد کہ از وے جدا ماند، آں را دوست ندارد۔ پس بنا بریں دوست داشتنِ زن و فرزند خطر است، زیرا کہ شاید کہ نمانند، و دردِ مفارقت آں بماند۔ و ہم چنیں تمام امورِ دنیوی از پادشاہی و حکومت و جاہ و مال و سائر شہوات و لذات جسمانی بلکہ بدن و اجزائے آں، زیرا کہ

اینہا ہمہ بمرگ ازو جدا خواہند شد ؛ و چوں جدائی پدید آید ، درد ظاہر شود ۔ رباعی

چیزے کہ نہ روئے در بقا باشی ازو   آخر ہدفِ تیرِ بلا باشی ازو
از ہر چہ بمیرد و جدا باشی ازو (کذا)   آں بہ کہ بزندگی جدا باشی ازو

و بداں کہ اندازۂ قوت و شدت درد بحسبِ اندازۂ قوت و شدتِ محبت باشد ۔ ہر چند محبتِ چیزے بیشتر ، درد جدائی ازو سخت تر ۔ اما آنچہ ازوے جدائی ممکن نیست ، معرفت و محبت پروردگار ست تعالیٰ شانہ ، زیرا کہ ذاتِ حق جل جلالہٗ از فنا و عدم منزّہ است و جوہر روح ہرگز نیست نشود ؛ و بسببِ فساد و خرابیِ تن فاسد و متغیر نگردد ۔ و پس ہر کس کہ دوستی حق اختیار نماید ، ہرگز از دوست خود جدا نگردد و بدردِ جدائی ازو مبتلا نشود ۔ لاجرم ہرگز او را غم و اندوہ نباشد اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۱ و نعم ما قال الشاعر المحقق فی ذالک المعنیٰ ۔ رباعی

ہر صورتِ زیبا کہ ترا روے نمود   خواہد فلک از چشمِ تو روزیش ربود
رَو ، دل بکسے دہ کہ در اطوارِ وجود   بود ست ہمیشہ با تو و خواہد بود

واللہ الموفق والمعین ؛

فصلِ ہفتم

دربیانِ مراتبِ ارواحِ انسانی

بداں کہ مراتب ارواح بشری سہ است : اصحابِ سعادت ، اصحابِ سلامت و اربابِ شقاوت ۔ و در قرآن مجید وصفِ اصحابِ سعادت اینست وَ اَمَّآ اِنْ کَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ فَرَوْحٌ وَّ رَیْحَانٌ وَّ جَنَّةُ نَعِیْمٍ و در حسابِ سعادتِ انسان سہ چیز فرمودہ ۔ اول رَوح ، دوم ریحان سوم جنتِ نعیم ، پس بباید کوشید تا معلوم شود کہ روح و ریحان کہ مقدم اند بر جنتِ نعیم ، کہ ہند حقیقت آں جز مقرباں را معلوم نشود و خدمتگارانِ درگاہِ سلطانِ صاحب قرآن را بقدر خدمت و توفے حاصل شود ۔ و اما اصحابِ سلامت وصفت ایشان این است : وَاَمَّآ اِنْ کَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ۲ و اصحابِ شقاوت

Marfat.com

را حال ایں وَ أَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ فَنُزُلٌ مِنْ حَمِيمٍ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ ۱۳
بداں کہ دریں آیات اسرار بسیار است کہ جز جانِ صدیقاں محرم آں نباشد و آں را در قلم آوردن و در کاغذ نوشتن روا نباشد و حکایتِ آں حالت ایں باشد وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۱۴ لیکن ما از برائے راہ نمودن مثالے بیان کنیم تا در آں حقیقت کشودہ شود ۔

بداں کہ اکثر اجزاے کوہہا و خاکہا ہمہ خاک تیرہ باشد و در آں ہیچ جزوے از اجزائے زر یافت نشود و بعض کوہہا و خاکہا بود کہ اجزاے زر باآں آمیختہ باشد لیکن آں قسم خاک و سنگ کہ در وے ہیچ زر نباشد، بیشتر بود، از آنچہ زر در وے یافت شود، بلکہ غالب اجزائے عالم آں باشد کہ در وے ہیچ زر یافت نشود۔ و آں قسم کہ اجزاے زر باآں آمیختہ است متفاوت باشد، زیرا کہ گاہ باشد ...۱۵ و ہمچنیں زیادہ می شود تا بہ بہا مُنم (؟) رسد کہ اجزاے زر بدست توان گرفت؛ بلکہ شاید غارے پیدا شود پُر از زرِ سرخ خالص۔ اما ایں بغایت نادر بود و در ادوار و اعصار بیش از یک بار پیدا نشود و چوں مثال ایں پیدا شد، بداں کہ ارواحِ انسانی نسبت با معرفت و محبتِ الٰہی ہمیں حکم دارد، چہ اکثر ارواحِ اہل عالم از آمیختگی با معرفت و محبت حق سبحانہ و تعالیٰ خالی باشند و اکثر آنہا کہ دعویٰ آں کنند، از راہِ تقلید باشد و رعایت مصالح دنیوی و بحقیقت روح ایشاں را از آں نہ نصیبے باشد و نہ نصابے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اما بعضے باشند کہ جوہرِ روحِ ایشاں را با معرفتِ حق تعالیٰ مناسبتے و با محبتِ او آشنائی باشد ...۱۶

از دیدہ قدم بر سرِ جاں نہادند — تا یک دلِ دیوانہ بدست آوردند

و ہمچناں کہ خاکے کہ با او اجزاے زر آمیختہ باشد، مراتب بسیار دارد، تا بحدے رسد کہ جملہ غار پُر از زر خالص باشد، ہمچنیں مراتب ارواحِ بشری مختلف و بسیارست، تا بحدے رسد کہ جملگی روح غرقِ محبت و معرفت و طاعت حق سبحانہ و تعالیٰ باشد، سخن او از حق و ذکر او از فضل حق باشد و فکر او در آلا و نعماے حق باشد و اعتماد او بر کرمِ حق باشد۔ چوں بلا بیند، گوید: الضَّارُّ هُوَ؛ چوں آلا بیند، گوید: النَّافِعُ هُوَ۔ اگر کائنات خود را بر وے عرضہ کنند، در ہیچ ننگرد، و گوید: لَا هُوَ إِلَّا هُوَ۔ و بداں کہ ہمچناں کہ غارے پُر از زر باشد، کس نشان از و نشاسد، و جاے او ندانند، و کسے کہ آں را داند و جاے

135353

Marfat.com

آں شناسد، کس را از اں خبر ندہد ونشان آں با کسے درمیاں نہ نہد۔ ہمچنیں آن روح کہ غرق معرفت ومحبتِ حق باشد، کس اُو را نشناسد وجاے او نداند ونشان آں معنی کسے بروے نہ بیند وبے نام ونشان وبے سروسامان میرد۔ اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیری۔ شعر

للہ تحت قباب العز طائفۃ　　اخفاھم عن عیون الناس اجلالًا

ھم السلاطین فی اطمار مسکنۃ　　جَرّ واعلی القلۃ الخضراءِ اذیالًا

رباعی

زاں مے خوردم کہ روح پیمانۂ اوست　　زو مست شدم کہ عقل دیوانۂ اوست

درو ے ...؛

الھی الھی نور قلوبنا بانوار معرفتک واغرقنا فی بحار شوقك ومحبتك انك علی کل شیءٍ قدیر۔

فصل ہشتم

در بیان حکمت مرگ ودلائلِ آں

بداں کہ مرگ فعلِ حق است، تعالیٰ شانہٗ۔ چنانچہ فرمود: وَالَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ۔[18] وفعل حق عبث وباطل نباشد۔ بلکہ در مرگ حکمتہاے بسیار است۔

حکمت اوّل آنست کہ آدمی را سرمایۂ عقل دادند وبازرگانی بایں عالم فرستادند۔ پس چوں بایں عالم آمد، بازرگانی کرد وسود ادراکِ معارفِ الٰہی وحقائق نامتناہی کسب کرد۔ اگر ہمچناں در غربت ماند روا نبود، ومصلحت آں باشد کہ بوطنِ اصلی خود باز گردد۔ چنانچہ فرمود: اِرْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً[19]

حکمت دوم آنست کہ اگر من ہمیشہ زندہ بمانم، دیگراں را جاے نماند طالُوت علیم نیست کہ یکے ناہمہ دہد ودیگر را ہیچ ندہد۔ پس حکمت مقتضی آنست کہ چوں یکے در آمد واز مائدۂ نعمت نصیب یافت، برخیزد۔ تا دیگرے بجاے او نشیند ونصیب یابد۔ فرد:

زیں مائدۂ جہاں چہ خوردی وشکست (؟)　　برخیز کہ دیگراں بخواہند نشست

حکمت سوم آنکہ لذّتِ جسمانی بس مختصر است ومکدر۔ حاصل کار بیش ازیں نیست کہ چاشتگاہ

Marfat.com

خوانے پیش او نہند و نماز پیشیں کوزہ، وشمع ہنگام مثل ایں وجماعتے را می بیند و با ایشاں دروغ می گوید و بنفاق و ریا بسر می برند۔ حاصلِ کار حیاتِ جسمانی ایں ست کہ اگر عمر یک سال باشد، این ست و اگر صد سال ہمیں، و غافل چوں باز نگرد، ضائع کردن عمر باشد و چوں لذات وشہوات عالم مختصر و محقر ست و باوجود مختصرے جہل (؟) و مکدر، لائق حکیم نباشد، آدمی را در وے گذاشتن و اما سعادتِ آخرت ففیہا لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ پس ہر آئینہ مرگ از واجبات باشد، تا روح از مضیق ایں عالم خسیس خلاص [شود] و بفضائے عالم باقی نفیس رسد۔ شعر:

اقتلونی اقتلونی یا ثقات ان فی قتلی حیاۃ فی حیاۃ[20]

حکمت چہارم آنست کہ فرزند آں وقت کہ در شکم مادر بود و ہنوز از خوشی ایں عالم خبر نداشت او را ناخوش می آمد از آں موضع جدا شدن۔ پس حکمت الٰہی تقاضا کرد کہ او را باکراہ از آں جدا کرد و دریں عالم در آورد۔ ولیکن چوں بدیں عالم رسید، معلوم کرد کہ ایں عالم بہتر و شریف تر از آں موضع تنگ و تاریک [است] ہم بریں قیاس چوں آدمی را خواہند کہ ازیں عالمِ ظلمانی بیروں برند، او را ناخوش آید لیکن چوں بداں عالم رسد، او را معلوم شود کہ آں عالم نورانی و بہتر ازیں عالم ست وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ[21]۔

حکمت پنجم نفسِ ناطقہ را سعادت آں باشد کہ بحضرتِ کبریا رسد و از تنگنائے عالمِ ظلمانی ببالائے عالمِ نورانی بر آید۔ لیکن او را آمدن بخود میسر نشود۔ او را بر مرکب تن سوار کردند و او بدیں مرکب با قدامِ طاعت و عبادات بدر سرائے پردۂ قُلِ اللہ برسید۔ اگر دریں وقت ہمچناں بر پشت ستور بماند، از دیدار شاہ محروم شود۔ پس اولیٰ آں باشد کہ از پشت ستور فرود آید و ترک او بگوید، و بحضرتِ عزت رسد و در مجلس فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ[22] بنشیند

حکمت ششم کودکے کہ بعلم خواندن از وطن خود جدا شود و بغربت افتاد و در علم کامل شد، اہل او از کار او خبر یافتند، از برائے او قضا و خطابت[23] آمادہ کردند و مہمان خانہائے زیبا بیاراستند و ہمہ منتظر او شدند۔ اگر او ہمچناں در غربت قرار گیرد و خود را ازاں ہمہ خیرات محروم کردہ باشد[24] پس مصلحت آں باشد کہ ازاں غربت بوطن باز شود و با یاران و برادرانِ خود دراں موضع بنشیند

پس بریں قیاس متعلم روح از عالم روحانی بغربت آمد و در عالم جسمانی علم و معرفت و محبت حق تعالیٰ حاصل کرد. برادران اُولٰئِكَ [مَعَ] الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ [۲۵] مهمان خانهاے اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ [۲۶] آراسته کرده اولی آں بود که از غربت رو بوطن اصلی آورد و بدرگاه پادشاه ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ [۲۷] رو آرد و خود را زاں غموم غربت خلاص دہد۔

حکمت ہفتم آدمی کامل مادام که در حیاتِ جسمانی ست، ہمنشیں دیواں باشد و بعد ازمرگ ہمنشینِ فرشتگان۔ ببیں که کدام بهترست!

حکمت ہشتم برہاں گفتیم که روح آدمی از جنس عالم ارواح است وجسد وجثهٔ او از عالم اجسام وجنس باجنس اولیٰ باشد، ومرگ جز ایں نیست که روح از جسم جدا شود و با طائفهٔ روحانیان ومقرباں ہمنشیں گردد۔

حکمت نہم اگر حیاتِ جسمانی باقی بودے، نوبت از پدر بفرزند نرسیدے۔ پس گزشتن نوبت او آمدنِ نوبتِ ایں باشد۔ وہرچہ با بودِ او سبب بودِ او باشد، عاقبت نابودِ او بربودِ او غالب باشد۔ لاجرم كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ [۲۸] غالب باشد۔

حکمت دہم بنده در حیاتِ جسمانی با حق در شهود وحضور واز خلق محجوب، و بر آئینه کشف وتجلیِ نورِ حق تعالیٰ بهتر باشد۔ و وجوهِ حکمت بسیار است، حالیا بر ہمیں اختصار رفت۔

سوال: اگر کسے سوال کند که ایں حکمتہا که باز نمودی در مردن نیکاں وصالحاں راست، حکمتِ مرگِ بداں و فاسقاں چیست؟

جواب: گویم منقطع شدن شرِ ایشاں از خلقِ عالم واللہ اعلم باسرار حکمۃ

فصل نہم

در حقیقتِ زیارت وکیفیت تجلیِ ارواح

اگر سائلے گوید که مرا بیان کن فائدهٔ زیارت گذشتگاں چیست۔

Marfat.com

تعلقِ عشقی است و سخن در حقیقت این عشق سخت باریک ست و جز مقربانِ حضرت را از آن خبر نیست۔ ولیکن وجود این عشق سخت ظاہر ست، زیرا که جملہ حیوانات بالطبع از مرگ گریزانند۔ پس چوں روح از تن جدا شد، بعد از جدائی آں روح با این تن تعلق قوی ماند۔ چوں شخصے دیگر بزیارت آں خاک حاضر شود، روح آں زیارت کنندہ را با روحِ جدا شدہ آمیختگی و نزدیکی بسببِ آں خاک حاصل شود و ایں دو روح چوں دو آئینہ شوند، برابر یک دیگر بداشتہ؛ و بسببِ ایں تعلق ہر چہ دریں روح باشد، در آں روحِ دیگر پدید آید؛ و ہر چہ در آں باشد دریں۔ و ہر دو بسببِ یکدیگر روشن شوند۔ بباید دانست کہ روحِ مردِ زیارت کنندہ را قوتِ کسب زیادتی علم ہست و روحِ جدا شدہ را قوتِ تجلی، ولیکن قوتِ کسب ندارد۔ چوں ہر دو روح بواسطۂ آں خاک در برابر یک دیگر افتادند، قوتِ تجلیِ روحِ جدا شدہ بر تنِ مردِ زیارت کنندہ افتد و از وے اثرے یابد، و آں تجلیِ روحِ وے قوت گیرد۔ و از روحِ زیارت کنندہ اثرِ معرفتِ زیارت و طاعت و عبادت بروحِ جدا شدہ رسد و سببِ مزیدِ درجات او گردد۔ و ایں سخن از اسرارِ غیب است و بطریقِ قیاس معلوم شود۔ اما کیفیتِ تجلیِ ارواح و مخاطباتِ ایشاں از راہِ مکاشفہ معلوم شود۔ رزقنا اللہ بفضلہ۔

فصلِ دہم

در ذکرِ احوالِ خویش و حکایتِ دردِ عزا و ختمِ کتاب

فرزند محمد افاض اللہ علیہ اضعاف الرحمۃ والرضوان إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ہر چہ ازیں ضعیف در حسابِ حمیت و بشریت ست، در تنور سوزانست؛ و ہر چہ در حسابِ معرفت و ملکیت، نصیب از روح و ریحان ست۔ ابو جعفر منصور را پسرے وفات یافت، ابو حنیفہ کوفی بدیں سخن خرسند شد و از عزا بیروں آمد یقین دانم کہ رحمتِ خدا باں جم بیش از شفقتِ من است، زیرا کہ ہر شفقت کہ در دلِ من باشد، آں شفقتِ آفریدۂ

حق است۔ پس اگر از پیش رحمتِ حق نبودے، در دلِ خلق شفقت کے بودے۔ اوشان
ضعیف و حضرتِ ذوالجلال پروردگارِ کریم۔ امید می دارم کہ او را آنجا
مارا اینجا۔ یا کٓھٰیٰعٓصٓ، یا حٰمٓعٓسٓقٓ یا ھومن لاھو الا ھو یا من لا الٰہ الا ھو
یا غالبا علی الدھر والمکان، یا غنیًا من الحدث والامکان۔ افض علینا و
علی ذالک الضعیف سجال الرحمۃ والرضوان، انک انت الملک الدیان
حاصل، چشمے دارم گریاں و دلے از آتشِ درد فراق بریاں و جانے جھلسا ہوا
واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

تمام شد

حواشی

۱- اصل میں 'انداخت' ہی ہے، لیکن سیاق سے یہاں 'انداختند' چاہیے۔

۲- یہ محل 'مانند' کا ہے۔

۳- الاعراف ۷ : ۱۷۹۔

۴- ایضاً

۵- الحاقۃ ۶۹ : ۱۷

۶- الزمر ۳۹ : ۷۵

۷- الشوریٰ ۴۲ : ۱۱

۸- البقرۃ ۲ : ۲۱۳

۹- النور ۲۴ : ۴۰

۱۰- یونس ۱۰ : ۶۲

۱۱- الواقعۃ ۵۶ : ۸۸-۸۹

۱۲- ایضاً ۹۰-۹۱

۱۳- ایضاً ۹۲-۹۳

۱۴- آل عمران ۳ : ۷

۱۵- یہاں سے جلد بندی میں ایک سطر کٹ گئی ہے۔

۱۶- ظاہراً یہاں ایک سے زیادہ سطریں ضائع ہو گئی ہیں۔

۱۷- یہاں سے بھی ایک سطر (دوسرا شعر) جلد بندی میں کٹ گئی ہے۔

۱۸- الملک ۶۷ : ۲

۱۹- الفجر ۸۹ : ۲۸

۲۰- مثنوی مولانا روم، دفتر ۳ ص ۲۲۹

۲۱- العنکبوت ۲۹ : ۶۴

۲۲- القمر ۵۴ : ۵۵

۲۳- مخطوطے میں یہ لفظ صاف نہیں، تصحیح قیاسی ہے۔

۲۴- ظاہراً یہاں کچھ عبارت لکھنے سے رہ گئی ہے۔

۲۵- النساء ۴ : ۶۹

۲۶- الحجر ۱۵ : ۴۷

۲۷- الانعام ۶ : ۶۲

۲۸- الرحمٰن ۵۵ : ۲۶

۲۹- اصل میں یہی ہے۔ لیکن یہ محل روحانی کا ہے۔

Marfat.com

ہندوستان کی شرعی حیثیت

Marfat.com

Marfat.com

ہندستان کی شرعی حیثیت

"ہندوستان اور دارالحرب کے نام سے دارالاشاعت رحمانی مونگیر (بہار) کی طرف سے اعلیٰ کاغذ پر اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ بڑے سائز پر سات صفحے کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے جو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی ایک تحریر پر مشتمل ہے۔ اس تحریر میں ہندوستان کے متعلق دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ اصل تحریر فارسی میں ہے۔ اس پر اردو میں مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری امیر شریعت بہار نے ڈیڑھ صفحہ کی جو تقریب لکھی ہے اس میں انھوں نے اس کی روئداد لکھی ہے کہ یہ تحریر خانقاہ رحمانیہ تک کیوں کر پہونچی اور پھر جزم و یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ اس تحریر کے مصنف (صرف کاتب یا ناقل نہیں) حضرت شاہ صاحب ہی ہیں اور اس بنا پر یہ فتویٰ شاہ صاحب کا ہی ہے، امیر شریعت بہار نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگے ہاتھوں موجودہ ہندوستان کی نسبت بھی اپنے عندیہ کا اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"ظاہر ہے حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے جب کہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا، اس تحریر میں دارالحرب کے لیے جو اصل بنیاد بتلائی گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جاسکتی ہے۔"

اس بنا پر اس موضوع پر ہماری گفتگو کے دو جز ہوں گے۔ پہلے جز میں گفتگو زیر بحث تحریر و رسالہ سے متعلق ہوگی اور دوسرے جز میں موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق۔

Marfat.com

شاہ صاحب کی طرف اس تحریر کا انتساب غلط ہے

ہم خود حضرت الاستاذ کے خط سے آشنا ہیں اور آپ کے متعدد خطوط اور تحریریں ہمارے پاس محفوظ بھی تھیں جو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں گھر کے سب سامان کے ساتھ لٹ گئیں۔ اس بنا پر اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ تحریر لکھی ہوئی حضرت الاستاذ کے ہاتھ کی ہی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت الاستاذ اس کے صرف ناقل ہیں مصنف نہیں، کاتب ہیں، صاحب تحریر نہیں۔ اس بنا پر اس تحریر میں جو کچھ درج ہے اس کو شاہ صاحب کی رائے یا فتویٰ قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ چنانچہ اتنی بات تو مولانا منت اللہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ تحریر شاہ صاحب کے مسودات میں ملی ہے اور اس پر شاہ صاحب کے دستخط نہیں ہیں۔

کیا یہ فتویٰ حضرت گنگوہی کا ہے

اصل یہ ہے کہ اب سے کم و بیش بیتالیس برس پہلے یعنی ۱۳۵۲ھ میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی نے مکتبۂ دار التبلیغ دیوبند ضلع سہارنپور کی طرف سے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عربی نام "فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب ودار الاسلام" اور اردو نام "کیا ہندوستان دار الحرب ہے" تھا، مفتی صاحب اس رسالہ کے تعارف میں لکھتے ہیں:-

"ہندوستان کے دار الاسلام و دار الحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آنحضرت قطب عالم جنید زمان ابوحنیفۂ وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فتویٰ شائع کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق بعض اہل علم تلامذہ کے سوال کے جواب میں مفصل و مکمل تحریر فرمایا ہے اور جس کی نقل حضرت ممدوح کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحب نے احقر کو عطا فرمائی تھی اور حضرت کے اقارب و تلامذہ میں دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی اس کی نقلیں موجود ہیں۔"

علاوہ ازیں ہمارے شعبۂ دینیات کے لکچرر قاری محمد رضوان اللہ جن کو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ پر ایک ضخیم تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اسی سال پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی ہے ـــ مفتی محمد شفیع صاحب ان کو ایک خط مورخہ ۱۷ محرم الحرام ۸۳ھ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"میں قدیم زمانۂ طالب علمی سے سنتا تھا کہ حضرت گنگوہی کا کوئی فتویٰ اس سلسلہ میں مفصل ہے۔ پھر عرصہ دراز کے بعد میں گنگوہ گیا تو حضرت گنگوہی کے مسودات میں مجھے

سلسلۂ منشورات دینیات فیکلٹی ۔۳

پہلا ایڈیشن

پہلے ایڈیشن کے جملہ حقوق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے محفوظ ہیں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

Marfat.com

یہ فتویٰ ملا اور میں نے اسے حکیم مسعود احمد صاحب سے مانگ لیا جو آپ نے عنایت فرما دیا۔ میں نے اردو ترجمہ کے ساتھ اس کو شائع کر دیا۔"

جناب مفتی صاحب نے اس فتویٰ کو اس طرح شائع کیا ہے کہ اوپر اصل متن فارسی میں ہے اس کے نیچے خود مفتی صاحب کے قلم سے اردو ترجمہ ہے اور ادھر اُدھر جو حواشی ہیں وہ مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے لکھے ہیں جو اس زمانہ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے اب آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کو حضرت گنگوہی کی تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ اوّل الذکر موخر الذکر کی حرف بہ حرف نقل ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ فتویٰ کے ناقل چونکہ حضرت شاہ صاحب خود ہیں اس لئے املا اور کتابت کے اغلاط سے یہ تحریر بالکل پاک وصاف ہے اور مفتی صاحب کے شائع کردہ رسالہ میں متعدد غلطیاں تصحیح سے رہ گئی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت شاہ صاحب نے اس کو نقل کرتے وقت اصل عبارت میں جو بعض جملے مکرر یا غیر ضروری تھے ان کو حذف کر دیا ہے۔ اس معمولی فرق کے علاوہ دونوں تحریریں من وعن ایک ہیں، اس بنا پر جیسا کہ مفتی صاحب نے لکھا بھی ہے جہاں حضرت گنگوہی کے متعدد اقارب وتلامذہ کے پاس حضرت کے اس فتویٰ کی نقول موجود تھیں ایک نقل حضرت شاہ صاحب کے پاس بھی تھی اور اس کو ہی خود حضرت شاہ صاحب کی تحریر سمجھ کر آپ کی طرف منسوب کر کے چھاپ دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے متعلق حضرت شاہ صاحب کی رائے

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ زیر تبصرہ فتویٰ حضرت شاہ صاحب کا ہرگز نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ خود حضرت شاہ صاحب کا اس بارہ میں خیال کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان دار الحرب نہیں بلکہ دار الامان بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ فقہا کی اصطلاح میں (جس پر بحث آگے آرہی ہے) دار العہد تھا۔ چنانچہ دسمبر ۲۷ء میں پشاور کی جمعیۃ علمائے ہند کی عظیم الشان سالانہ کانفرنس میں بحیثیتِ صدر کے آپ نے جو ایک نہایت معرکہ آرا خطبۂ صدارت فارسی زبان میں پڑھا تھا اس میں اس کا ذکر کیا ہے اور ہندوستان کی اس وقت کی پوزیشن کا مقابلہ اس وقت سے کیا ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودِ مدینہ کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

"ملک ما اگرہست دار امان ست وما سکونت اندران داریم. باید کہ احکام این دار از کتب مذہب تلاش کنیم. استیعاب آن این وقت ممکن نیست البتہ جملہ چند از معاہدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم با یہود مدینہ در ابتداء ہجرت از سیرت ابن ہشام نقل می کنم کہ نمونہ از نوعیت معاہدہ با غیر مسلم در غیر دار اسلام معلوم شود[1]"

شاہ صاحب ہندوستان کو دار العہد مانتے تھے اسی وجہ سے پشاور کے مذکورۂ بالا اجلاس میں حکومت ہند سے محکمۂ قضا کے قیام کا مطالبہ کیا گیا اور اس سلسلہ میں جو تجویز منظور ہوئی تھی اس میں محکمہ سے متعلق یہ الفاظ بھی تھے" جو بحسب معاہدۂ حکومت ہمارا شرعی حق ہے[2]"

حضرت گنگوہی کا ایک اور مطبوعہ فتویٰ

اب آیئے اصل تحریر پہ گفتگو کریں. جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا اور لکھا ہے. اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے تو قطع نظر اس بات کے کہ اس تحریر پہ حضرت گنگوہی کے دستخط نہیں ہیں اور یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مسودات میں مفتی صاحب کو اسی طرح ملی تھی جس طرح مولانا منت اللہ کو شاہ صاحب کے مسودات میں دستیاب ہوئی تھی. ایک بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اس تحریر میں حضرت گنگوہی نے پوری قوت و صراحت کے ساتھ ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا ہے، لیکن اور فتویٰ جو مطبوعہ ہے اور جس پر آپ کے دستخط اور مہر بھی ہے وہ فتویٰ اوّل کی تردید کرتا ہے چنانچہ ایک شخص نے سوال کیا "ہند دار الحرب ہے یا نہیں"؟ اس کے جواب میں فرمایا:

"ہند کے دار الحرب ہونے میں اختلاف علماء کا ہے. بظاہر تحقیق حال بندہ کی خوب نہیں ہوئی حسب تحقیق اپنی کے سب نے فرمایا ہے اور اصل مسئلہ میں کسی کو خلاف نہیں اور بندہ کو خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے[3] فقط واللہ تعالیٰ اعلم."

---

[1] مہاجر دیوبند ج ۲ نمبر ۱ ص ۱۰۔ [2] مہاجر ج ۲ نمبر ۱

[3] فتاویٰ رشیدیہ مطبوعہ قرآن محل کراچی. باب الربوا ص ۴۴۳۔

Marfat.com

رشید احمد عفی عنہ گنگوہی۔ غور کیجئے کہاں وہ جزم ویقین اور کہاں یہ تردد وتذبذب۔ اس موخرالذکر فتوی پر جو تاریخ کندہ ہے وہ ۱۳۰۱ ہجری ہے۔ پہلے فتوی پر نہ دستخط ہیں اور نہ تاریخ۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ اگر واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے تب بھی تو فتوی ثانی پر یقیناً برسوں مقدم ہوگی۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ۱۳۰۱ ہجری سے برسوں پہلے تو حضرت کو ہند کی کیفیت، کا بخوبی اور واضح طور پر علم تھا اور اس بنا پر آپ نے ملک کو دارالحرب قرار دے دیا۔ لیکن اس واقعہ کے برسوں بعد آپ کو ہند کی کیفیت کی خوب تحقیق نہیں رہی اور اس لیے اب ہند کو نہ دارالاسلام فرماتے ہیں اور نہ دارالحرب۔ کیا کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس ترتیب کو باور کرسکتا ہے !!

ایک تضاد | اس کے علاوہ ایک اور اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ مفتی محمد شفیع صاحب کے شائع کردہ رسالہ کے خاتمہ پر مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے حواشی کے علاوہ ایک عبارت لکھی ہے جس میں وہ حضرت گنگوہی کے حوالہ سے ہندوستان کو دارالامان کہتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"یہاں یہ بات ظاہر کردینا بہت ضروری ہے کہ آج کل ہندوستان باستثنار اسلامی ریاستوں کے اگرچہ حضرت مجیب (مولانا گنگوہی) اور حضرت شاہ عبدالعزیز اور بعض دیگر اکابر کی تصریح کے مطابق دارالحرب ہے۔ مگر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالامان ہے۔ . . . . . یہی وجہ ہے کہ یہاں سے مسلمانوں کو ہجرت ضروری نہیں ہے۔ کاتب الحروف کے استفسار پر حضرت گنگوہی نے ایسا ہی مشافہتہً فرمایا تھا جو بندہ کو خوب اچھی طرح سے یاد ہے[1]"

ان تینوں تحریروں کو سامنے رکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولانا گنگوہی نے ہند کی نسبت فرمایا۔

(الف) ہند دارالحرب ہے۔

(ب) ہند کے متعلق بندہ کو خوب تحقیق نہیں۔

---

[1] رسالہ مذکورہ ص ۱۶

Marfat.com

(ج) ہند دار الامان ہے۔

اب کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

تاریخی پس منظر | حقیقت یہ ہے کہ آپ اس معمہ کو اس وقت تک حل کر ہی نہیں سکتے جب تک ان آرا اور افکار و خیالات کو گذشتہ دو ڈھائی سو برس کی تاریخ کے پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت پر زوال طاری ہوا تو کسی منزل پر پہونچ کر رکا نہیں، بلکہ روز بروز حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانے میں ہی جو عالمگیر کی وفات سے پانچ برس یعنی ۱۷۰۲ء میں پیدا ہوئے تھے پوری سوسائٹی "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" کا مصداق بن گئی تھی۔ چنانچہ شاہی خاندان، اعیان و امراء، علماء، صوفیا، تجار، عوام اور خواص غرضکہ کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس کا ماتم شاہ صاحب نے تفہیمات میں خصوصاً اور دوسری کتابوں میں عموماً بڑے درد و کرب کے ساتھ نہ کیا ہو، اخلاقی زندگی کے حد درجہ فاسد ہونے کے ساتھ بد امنی اور شورشِ عام کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال، ان کی عبادت گاہیں اور عورتوں کی عصمت و ناموس تک خطرہ میں تھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں۔

> "دہلی والوں کے لیے زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ بہت سے مسلمان تھے جو خودکشی کے ذریعہ ان مصائب و آلام ناگفتنی سے رستگاری کی سوچنے لگے تھے"[۱]

اس وقت خوف و ہراس اور دہشت و سراسیمگی کا کیا عالم تھا! اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ کے اس شعر سے ہوگا!

کانّ نجوماً اومضت فی الغیاھب   عیون الافاعی اورؤس العقارب

ترجمہ:۔ جو تارے تاریکیوں میں چمکتے ہیں وہ بھی ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا وہ سانپوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے ڈنک۔

ہندوستان جو فقہاء کی اصطلاح کے مطابق چھ سو برس سے دار الاسلام بنا چلا آرہا تھا۔ ان حالات نے شاہ صاحب جیسے مفکر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اب بھی دار الاسلام ہے یا

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت ص ۱۳۰

نہیں؟ اگرچہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گذرا کہ شاہ صاحب نے ملک کو دارالحرب کہا ہو لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دارالاسلام کے نہیں ہو سکتے اور اس بنا پر یہ بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نیم شعوری ذہن میں ہندوستان کی نسبت دارالحرب میں منتقل ہو جانے کا تصوّر موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے نہایت اثر انگیز اور پُرجوش خطوط کے ذریعہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو فوجی طاقت کے ذریعہ اصلاحِ حال کی دعوت دی اور آخر کار جب اس سے کام نہیں چلا تو احمد شاہ ابدالی کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جس میں ملک کی سیاسی حالت کو واضح طور پر بیان کرنے کے بعد مکتوب الیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کو مرہٹہ راج گردی سے نجات دے[1]۔

ابدالی طوفان برق وباد کی طرح آیا مگر!

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا | سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!

میدانِ پانی پت میں اس نے مرہٹوں کو شکستِ فاش دی اور جو کچھ ہاتھ لگا اسے لے لوا واپس چلا گیا۔ اس زبردست بھونچال سے عبرت پذیر ہو کر سنبھلنے کے بجائے مریض سلطنت کا حال اور ابتر ہو گیا مرہٹوں کا اب وہ زور تو رہا ہی نہیں تھا اس بنا پر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک غیر ملکی اور اجنبی طاقت انگریزوں کی ابھرنی شروع ہوئی۔ یہ نہایت منظم، ترقی یافتہ اور حوصلہ مند طاقت تھی، اس نے جنوب اور مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے پورے ملک میں اس درجہ اثر و نفوذ قائم کر لیا کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہو گئیں اور اکبر و جہانگیر کے تخت و تاج کا وارث شاہ عالم انگریزوں کا وظیفہ خوار قیدی بن کر رہ گیا۔

شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ | یہ بالکل ایک نئی صورتِ حال تھی جو اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آئی تھی اس بنا پر شاہ عبدالعزیز (از ۱۱۵۹ھ تا ۱۲۳۹ھ) جو ایک جماعت کے ساتھ اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری امانت کے حامل اور ترجمان تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ چنانچہ بعض کتبِ فقہ سے کچھ عبارتیں نقل کرنے کے

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص از ۴۵ تا ۵۳

بعد فرماتے ہیں:۔

"اس شہر (دہلی) میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں ہے، بلکہ نصاری کے سرداروں اور افسروں کا حکم بے دغدغہ جاری ہے .... ہاں اگر بعض اسلامی احکام مثلاً جمعہ اور عیدین اور اذان اور گاؤکشی وغیرہ سے یہ لوگ تعرض نہیں کرتے ہیں تو پڑے نہ کریں مگران احکام کی اصل الاصول ان کے نزدیک بالکل ہیچ اور ضائع ہیں۔ کیوں کہ مسجدوں کو جو خانۂ خدا ہیں بے تکلف مسمار اور خراب کرا دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلم یا ذمی (غیر مسلم) انگریزوں سے پناہ لیے بغیر دلی یا اس کے گرد و نواح میں داخل ہونا چاہے تو ممکن نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شجاع الملک اور ولایتی بیگم بھی ان لوگوں کی اجازت کے بغیر اس شہر میں نہیں آسکتے ...... غرضکہ جب حدیثوں اور صحابۂ کرام اور خلفائے عظام کی سیرت پر متجسس نگاہیں ڈالی جاتی ہیں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ شہر دار الحرب کا حکم رکھتا ہے[1]"

علاوہ ازیں ایک شخص نے دار الحرب میں سودی لین دین کے بارہ میں سوال کیا ہے تو حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں بھی دار الحرب اور دار الاسلام کی بحث چھیڑ دی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف اقوال وآرا نقل کرنے اور اپنی رائے بیان کرنے بعد لکھتے ہیں۔

" اور جب یہ ہے تو انگریزوں اور ان جیسے کافروں کے مقبوضات بلاشبہ دار الحرب ہیں "

دیگر علما کے فتاوی شاہ عبدالعزیز صاحب اس فتوے میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ دوسرے علما کا فتویٰ بھی یہی تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے۔

---

[1] فتاوی عزیزیہ ص ۱۶ و ۱۷

"جوں جوں ہماری (انگریزوں کی) طاقت مضبوط ہوتی گئی علما کے فتووں میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحی صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز کے بعد ہوئے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں کہ "عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے تک) سب کی سب دارالحرب ہے کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پاچکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہوجائیں وہ دارالحرب ہے[1]"

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک | ہندوستان کے انگریزی مقبوضات جن میں دلی بھی شامل تھی، ان کے خلاف علمائے اعلام کی طرف سے دارالحرب ہونے کا اعلان ہوجانے کے بعد اب مسلمانوں کے لیے صرف دو راہیں ہی ہوسکتی تھیں، ایک یہ کہ اگر ان میں ہمت ہے تو جہاد کریں اور دوسرے یہ کہ اگر جہاد نہیں کرسکتے تو ہجرت کرجائیں۔ دوسری شکل اختیار کرنا حد درجہ کی بزدلی اور نامردی کی بات تھی اس لیے پہلی صورت اختیار کی گئی۔ چنانچہ مدرسۂ شاہ ولی اللہی کے تربیت یافتہ خصوصی سید احمد شہید بریلوی ۱۶ جنوری ۱۸۲۶ء کو اپنے پانسو چھ سو معتقدین و مریدین کے ساتھ وطن مالوف سے روانہ ہوئے مہینوں کے سخت دشوار اور کٹھن سفر کے بعد ایک جمعیت کثیر مہیا کی اور سرحد پہونچ کر ۱۸۲۷ء کے ابتدا میں جہاد کا اعلان کردیا۔ یہ اعلان اگرچہ پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا جہاں اسلامی شعائر کے علانیہ اظہار و بجاآوری تک پر پابندیاں تھیں لیکن سید صاحب نے کل ہند پیمانہ پر جو تیاریاں کی تھیں وہ صاف طور پر اس بات کی علامت ہیں کہ آپ کا اصل مقصد ہندوستان سے انگریزی اقتدار ختم کرنا اور اسے صحیح معنی میں دارالاسلام بنانا تھا۔ چنانچہ آپ نے سرحد سے ریاست گوالیار کے مدارالمہام راجہ ہندو راؤ کو جو مکتوب گرامی لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں:-

"جناب پر یہ بات روشن اور ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ سمندر پار سے یہاں آکر بادشاہ زمین و زماں ہوگئے ہیں اور جو سوداگر تھے وہ سلطنت کے مرتبہ کو پہونچ

---

[1] بحوالہ نقش حیات از مولانا سید حسین احمد مدنی جلد ۲ حاشیہ ص ۴

گئے ہیں، ان لوگوں نے بڑی بڑی امارتیں اور ریاستیں برباد کردی ہیں اور ان کی عزت وآبرو کو خاک میں ملا دیا ہے (ان حالات کے باوجود) چونکہ اربابِ ریاست وسیاست گوشۂ گمنامی وبے عملی میں پڑے ہوئے ہیں اس لئے ہم چند فقیر واہلِ مسکنت محض دین رب العالمین کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔"

علاوہ ازیں مذکورۂ بالا ریاست کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خاں کو جو خط لکھا ہے اس میں بھی اسی مضمون کا اعادہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

"آپ سردار والا مراتب راجہ ہندو رائے کو یہ امر ذہن نشین کرا دیں کہ ہندوستان کے اکثر شہر غیر ملکی لوگوں (انگریزوں) کے قبضہ میں جا چکے ہیں اور یہ ہر جگہ ظلم و زیادتی کر رہے ہیں ہندوستانی ریاستوں کو انھوں نے برباد کر دیا ہے اور کوئی شخص ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا۔ بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں چونکہ بڑے بڑے اربابِ ریاست ان کے ساتھ نبرد آزمائی سے عاجز ہیں اس لیے ہم چند ضعیف و کمزور انسان کمرِ ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔[1]

قدرت اپنی حکمتیں خود ہی جانتی ہے۔ یہ جہاد ناکام رہا اور سید صاحب گھر سے ایسے رخصت ہوئے تھے کہ پھر واپس نہ آئے۔ ایک رہروِ راہِ طلب وجستجو کی غیرت وخودداری کی انتہا ہے!

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے (غالب)

سید صاحب اپنے ہزاروں فداکاروں کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرکے واصل بحق ہوگئے لیکن جو آگ ہزاروں دلوں میں روشن کر چکے تھے وہ دشمن کے آبِ شمشیر سے کہاں بجھ سکتی تھی ان کے بعد تحریکِ مجاہدین کا ایک مکمل اور مربوط سلسلہ صادق پور سے درۂ خیبر تک قائم ہوگیا۔ اور اب ان کا براہِ راست مقصد انگریزوں کو ملک باہر کرکے اس کی قدیم حیثیت کو بحال کرنا تھا، ادھر یہ مجاہدین

---

[1] مجموعۂ خطوط قلمی بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا" از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۲۶-۲۴۶

اپنی جدوجہد میں مصروف تھے اور ادھر دلی اور لکھنؤ میں تیزی سے وہ حالات پیدا ہو رہے تھے جن کے بطن سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ظہور ہوا۔

جہاد کا براہِ راست فتویٰ آخر انگریزوں کی روز افزوں زیادتیوں اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی بیچارگی و بے بسی کے باعث جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو دلی کے اخبار "الظفر" میں کھلم کھلا یہ استفتا چھپا:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرضِ عین ہے یا نہیں؟....."

اس استفتا کا جواب مرتب کرنے کے لیے جامع مسجد دلی میں علمائے کرام کا ایک اہم اجتماع ہوا اور فتویٰ ذیل مرتب کر کے شائع کیا گیا:

الجواب: درصورتِ مرقومہ فرضِ عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرتِ اجتماعِ افواج کی اور موجود مہیا ہونے آلاتِ حرب کے تو فرضِ عین ہونے میں کیا شک رہا الخ[۱]"

مولانا فضل حق کا فتویٰ اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل موجود ہے اس پر ۳۸ دلی کے علما و مشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں، لیکن ان کا ایک الگ مستقل فتوائے جہاد تھا جس کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے[۲]، مولانا بلند پایہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت و جسارت اور دینی حمیت و غیرت کا

---

[۱] مجموعہ خطوط قلمی بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۲۷۴-۲۷۶

[۲] جنگِ آزادی از خورشید مصطفےٰ صاحب رضوی ص ۵۶۸۔

Marfat.com

یہ عالم تھا کہ انھوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلّی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد جہاد کے ایک اور فتوے کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدر الدین خان آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبر آبادی اور دوسرے علما کے دستخط تھے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں آگ لگ گئی اور خاص دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی[۱]۔ ادھر یہ ہوا اور دوسری طرف اکابر دیوبند جو سلسلۂ ولی اللہی کے بقیۃ السلف تھے یعنی حضرت حاجی امداد اللہ۔ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی وغیرہم انھوں نے باقاعدہ جہاد کا فتویٰ دیا اور جب جنگ چھڑی تو اس میں عملاً حصّہ لے کر دادِ شجاعت دی۔

مسلمانوں کے لیے یہ جہاد تھا۔ لیکن استخلاص وطن کی غرض سے غیر مسلم بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ اور اس بنا پر اس کا اہتمام و انتظام بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ لیکن بایں ہمہ یہ کوشش بھی ناکام رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے باضابطہ طور پر تاج برطانیہ کے مقبوضات و مستعمرات میں شامل ہوگیا۔ اس جنگ میں ناکامی کے باوجود مجاہدین نے ہار نہیں مانی اور ان کی سرگرمیاں ایک خاص دائرۂ عمل میں برابر جاری رہیں اور ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۸ء میں انگریزوں اور مجاہدین میں سخت معرکہ ہوا۔

اگرچہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا کہ اب کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا ہر شخص کو مذہبی آزادی ہوگی اور حصولِ معاش کے دروازے کسی پر بند نہیں ہوں گے لیکن شروع شروع میں اس اعلان پر خاطر خواہ عمل نہیں ہوا اور مجاہدین کی سرگرمیاں بھی برابر جاری رہیں۔ لیکن انگریزوں کی حکومت میں جتنا استحکام پیدا ہوتا رہا۔ ملک میں امن و امان اور انفرادی و جماعتی آزادی کی فضا پیدا ہوتی رہی۔ اب مذہب آزاد تھا۔ دینی تعلیم و تبلیغ پر کوئی پابندی نہیں تھی، قانون مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت کرتا تھا اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا۔ حصولِ معاش کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو سرکاری

---

[۱] الثورۃ الہندیہ ص ۵۶۔

دفتروں اور محکموں میں جگہیں مل رہی تھیں۔ غرضکہ اب انگریز کے ساتھ جنگ کا دور ختم ہوچکا تھا۔ ملک میں ایک آئینی حکومت قائم تھی۔ اگرچہ بدیسی تھی اور یہ صورت پہلی صورت حال سے بالکل مختلف تھی۔ پہلے جنگ تھی۔ اب صلح تھی۔ پہلے حرب وضرب کا دور تھا اب امن وامان کا عہد تھا اور اب مسلمانوں کے لیے موقع تھا کہ وہ تعلیمی اقتصادی اور مذہبی بنیادوں پر تنظیم کرکے اپنے لیے نشاۃِ ثانیہ کا سروسامان کریں۔

مولانا گنگوہی کے مختلف اقوال کے وجوہ سطورِ بالا میں ہم نے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے لے کر انیسویں صدی کے ربعِ آخر تک کے حالات کا جو نہایت ہی مختصر اور سرسری جائزہ لیا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس پوری مدت میں ملک کے حالات یکساں نہیں رہے بلکہ ادلتے بدلتے رہے ہیں اور جو تغیر ہوتا رہا ہے بحیثیتِ مجموعی علما کا اس ملک کے متعلق شرعی نقطۂ نظر بھی بدلتا رہا ہے۔ اس بنا پر مولانا گنگوہی سے اگر اس سلسلہ میں تین قول ثابت ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں بلکہ یہ حالات کے تغیر کا اثر ہے۔ چنانچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا کا پہلا فتویٰ بزبان فارسی وشائع کردہ مفتی محمد شفیع صاحب یا تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے کا ہے یا اس کے فوراً بعد کا جبکہ پکڑ دھکڑ بڑے پیمانہ پر جاری تھی اور ادھر مجاہدین بھی سرگرم عمل تھے۔ اس کے بعد جب حالات ذرا بہتر ہوئے۔ مگر مطلع بالکل صاف نہیں ہوا تھا تو مولانا کو اس پہلی رائے پہ اصرار تو نہیں رہا۔ لیکن ساتھ ہی کھل کر دار الحرب ہونے کی نفی بھی نہیں کرسکے۔ اور جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کسی قطعی بات کے کہنے سے معذرت فرمادی۔ پھر جب حالات اور زیادہ بہتر ہوئے امن وامان مکمل طور پر بحال ہوگیا اور مذہبی فرائض ومعمولات بلاخوف وخطر ادا ہونے لگے تو اب حضرت گنگوہی نے اس کو دار الامان ہی قرار دیا۔

حضرت نانوتوی کا ارشاد مولانا گنگوہی نے تو ترقی کرکے ہندوستان کو دار الامان ہی کہا ہے لیکن مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے "ہندوستان میں سود کی لین دین" پر بصورتِ مکتوب جو ایک نہایت پُرمغز اور مبسوط رسالہ لکھا ہے اس میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

باعتبارِ روایاتِ منقولہ ہندوستان دار الاسلام ہے — ان روایات کے پیشِ نظر ہندوستان دار الاسلام ہے

اگرچہ اس معاملہ میں مولانا کو پورا اطمینان نہیں ہے۔ چنانچہ آخر رسالہ میں فرماتے ہیں:

Marfat.com

"دار الحرب بودن ہندوستان کلام چنانچہ از مطالعۂ روایات منقولہ دریافتہ باشی اگرچہ راجح نزد ہیچمدان ہمین باشد کہ ہندوستان دار الحرب است[1]

ہندوستان کے دار الحرب ہونے میں کلام ہے جیسا کہ گذشتہ روایات منقولہ سے تم کو معلوم ہوا ہوگا اگرچہ اس ہیچمدان کے نزدیک راجح یہی ہے کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔

لیکن چونکہ رسالہ کا اصل موضوعِ بحث دار الحرب میں "سودی لین دین" ہے اس بنا پر مولانا نے اس پر بڑی سیر حاصل بحث کے ضمن میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ " اوّل تو ہندوستان دار الحرب نہیں دار الاسلام ہے۔ لیکن اگر دار الحرب ہے بھی تو مسلمان کے لیے حسب روایاتِ فقہیہ یہ کہاں جائز ہے کہ وہ دار الحرب میں قیام کر کے سود کھاتا رہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ سود دار الحرب میں لے اور اسے برتے دار الاسلام میں جو لوگ ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر اس میں سودی لین دین کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مولانا نانوتوی ان پر ایک نہایت لطیف قسم کا طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ بڑے عجیب و غریب قسم کے لوگ ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اچھا! اگر ہندوستان دار الحرب ہے تو تمہیں ہجرت کرنی چاہیے۔ اس پر وہ کہتے ہیں کہ یہ دار الاسلام ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ یہاں سودی کاروبار جائز نہیں تو جھٹ بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو دار الحرب ہے، گویا چت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی، ہجرت سے بچنے کے لیے اس ملک کو دار الاسلام کہہ دیا اور سود کھانے کے لیے اسے دار الحرب قرار دے دیا۔ سبحان اللہ![2]

مولانا عبد الحی لکھنوی کا فتویٰ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی اُن علما میں سے تھے جنھوں نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ میدان جنگ میں اس سے مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران میں اور اس کے بعد مسلمانوں کی خصوصاً اور عام اہلِ ملک کی عموماً عظیم تباہی

---

[1] قاسم العلوم جلد اوّل مشتمل بر مکتوب ہفتم و ہشتم۔ مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۸ و ۳۵۔
[2] قاسم العلوم جلد اوّل مشتمل بر مکتوب ہفتم و ہشتم۔ مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۹۔

وبربادی خستہ حالی و پامالی بچشم خود دیکھی تھی۔ اس بنا پر حالات خواہ کیسے ہی پُر امن ہوں بہر حال انگریز کے خلاف دلوں میں جو کدورت اور عہدِ گذشتہ کی جو تلخ یاد تھی اس کی وجہ سے یہ حضرات ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق کوئی بات کہتے بھی ہیں تو رک رک کر اور کسی درجہ میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ لیکن مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی جن کی پیدائش ہی ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے اُن کے لیے اس قسم کا کوئی حجاب ذہنی نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے بالکل صاف وصریح لفظوں میں ہندوستان سے دارالحرب ہونے کی نفی کی اور اس کے دارالاسلام ہونے کا اثبات کیا ہے۔

سوال یہ تھا کہ "جہاں تک عملداری انگریزوں کی ہے ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو صرف صاحبین کے مذہب کے مطابق یا ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق بھی" مولانا جواب میں فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔" اس کے بعد مولانا نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کتبِ فقہیہ سے طویل عبارتیں نقل کیں اور ان کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔

"ان عبارات سے اور ان کے امثال سے واضح ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہونے میں یہ شرط ہے کہ احکامِ کفر علانیہ جاری ہوں اور احکامِ اسلام بالکلیہ موقوف کردئے جائیں اور شعائرِ اسلام اور ضروریاتِ دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں اور یہ شرط اتفاقی (متفق علیہ) ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس بلدہ میں اور دارالحرب میں کوئی بلدہ مملکت اہلِ اسلام کا باقی نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ امان اوّل اٹھ جائے اور بامانِ کفار اقامت کی نوبت آئی ہو اور ظاہر ہے کہ بلادِ ہندوستان میں یہ مفقود ہے۔ اس لیے کہ شعائرِ اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت اور ممانعت نہیں ہے۔ اگرچہ اکثر قضاۃ کفار ہیں اور خلافِ اسلام احکام جاری کرتے ہیں مگر بہت سے امور میں مذہبِ اسلام اور شرع کے موافق بھی فیصلہ کرتے ہیں۔ پس ہندوستان امام ابوحنیفہ

اور صاحبین رحمہم اللہ کسی کے نزدیک دار الحرب نہیں ہے[1]۔

ایک اور فتویٰ | اسی نوع کا ایک اور فتویٰ کلکتہ میں نواب عبد اللطیف صاحب نے جب انھوں نے بنگال میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک شروع کی تھی۔ بعض علماء سے حاصل کر کے شایع کیا تھا ان علماء میں تحریک مجاہدین کے ممتاز عالم مولانا کرامت علی صاحب بھی شامل تھے اور فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ "انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دار الحرب نہیں ہے[2]۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمان "لذت کشی دردتہ جام" کی زندگی بسر کر رہے تھے اس وقت مسلمانوں میں کوئی سیاسی تحریک نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو خفیہ یعنی انڈر گراؤنڈ اور ان کی تمام تر توجہات دیوبند اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر جیب و دامان تار تار پر بخیہ گری کے لیے وقف تھیں۔ کانگریس اور لیگ دونوں اگرچہ وجود میں آچکی تھیں لیکن اوّل الذکر کا مقصد انگریزوں کے ماتحت چند داخلی اور انتظامی اصلاحات اور موخر الذکر کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا اس بنا پر ہندوستان پر جب دار الحرب کی تعریف صادق نہیں آتی تھی تو مولانا عبد الحی کو لامحالہ اسے دار الاسلام ہی کہنا تھا[3]۔

تحریک ہجرت | لیکن جن علماء کے سینوں میں سید احمد شہید کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے ابھی تک خاکستر نہیں ہوئے تھے وہ کب نچلے بیٹھنے والے تھے انھوں نے ایک فتویٰ کے ذریعہ ترک وطن کی تحریک شروع کر دی مولانا غلام رسول مہر جو ہندو پاک کی جدید اسلامی تاریخ کے مبصر عالم ہیں بیان کرتے ہیں:

"تحریکِ خلافت کی تنظیم سے پیشتر علماء کے فتویٰ سے یہاں ہجرت کی تحریک

---

[1] ترجمۂ اردو مجموعۂ فتاویٰ مولانا محمد عبد الحی مطبوعہ قیوم پریس کانپور جلد اوّل ص از ۱۲۳ تا ۱۲۶۔

[2] ہندوستانی مسلمان (انگریزی) رام گوپال صاحب ص ۵ و ۶

[3] ہمیں ان حضرات اور مشائخ کا بھی علم ہے جنھوں نے سفید فام فرمانروایانِ ہند کو ناصر الملۃ والدین اور حامی شریعت مصطفوی کہا ہے اور ترکوں کے مقابلہ میں بھیجے ہوئے ہندوستانی مسلمان فوجیوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے ہیں لیکن ان حضرات کو عوام میں کوئی سندِ اعتماد و اعتبار حاصل نہیں ہے اس لیے ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔

جاری ہوئی۔ میرے نزدیک اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے اور دنیا بھر میں اسے بدنام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسرے ملکوں میں یہ اطلاع پہونچتی کہ لاکھوں مسلمان ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ہیں تو انگریزوں کے لیے نیک نامی کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ یہ وقتی تحریک تھی۔[1]

دوسری تحریکیں | انھیں دنوں میں یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت وشمولیت کا مسئلہ اٹھا اور مولانا گنگوہی، مولانا محمود حسن اور لدھیانہ و دیوبند کے بہت سے علماء نے کانگریس میں شرکت کے جواز اور سرسید کی قائم کی ہوئی جماعت "جماعتِ محبانِ وطن" میں شرکت کی ممانعت کا فتویٰ شایع کیا۔[2] پھر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قیادت میں تحریک انقلاب یا بالفاظِ دگر "ریشمی خطوط کی تحریک" شروع ہوئی اس کے بعد خلافت اور پھر ترکِ موالات کی تحریکوں کا دور آیا۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس پورے دور میں جبکہ انگریزوں کے خلاف یہ تحریکیں چل رہی تھیں، ہندوستان کی نسبت ان علماء کا جو تحریکوں سے وابستہ تھے شرعی طور پر کیا نقطۂ نظر رہا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ان تمام تحریکوں کا مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج اور ملک کی آزادی تھا۔ لیکن اگر یہ تمام کوششیں آئین اور قانون کے اندر رہ کر کی گئی ہیں تو ظاہر ہے اس صورت میں ملک کی شرعی حیثیت کچھ اور ہوتی ہے اور اگر ان تحریکوں میں حرب وضرب تشدد، اور قانون شکنی وغیرہ ان سب چیزوں کو تحریکوں کے بانی اور رہبر علما کی تائید ورضا مندی کی سند حاصل تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی نظر میں ہندوستان کی حیثیت پہلی حیثیت سے مختلف تھی۔

دارالعہد | اس سلسلہ میں ہم صرف دو تحریریں پیش کرسکتے ہیں۔ ایک مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کی اور دوسری مولانا سید حسین احمد مدنی کی! حضرت شاہ صاحب کے متعلق اجمالاً گزرچکا ہے

---

[1] ملاقاتیں: مرتبہ الطاف حسن صاحب قریشی ص ۱۸۷

[2] نقشِ حیات: از مولانا حسین احمد صاحب مدنی جلد دوم ص ۱۷

Marfat.com

کہ آپ نے پشاور کے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کو دارالامان کہا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اسی موقع پر اشارہ کیا تھا۔ درحقیقت شاہ صاحب کی مراد دارالامان سے دارالعہد ہے۔ چنانچہ خطبۂ متعلقہ میں آپ نے حکومت اور مسلمانوں کے تعلقات کی شرعی نوعیت کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا بدر عالم مرحوم حضرت شاہ صاحب سے نقل کرتے ہیں:-

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی ہندوستانیوں کو انگریز کے ہاتھوں میں قیدی سمجھتے تھے اور کسی معاہدہ کے قائل نہیں تھے لیکن میرے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ اگرچہ حکومت اور اہلِ ہند کے درمیان باقاعدہ کوئی معاہدہ نہیں ہے لیکن عملاً معاہدہ ہے۔ چنانچہ ہم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان تمام معاملات میں ہم ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کو کسی فقیہ نے نہیں لکھا ہے۔ مگر میرے نزدیک حکم یہی ہے اور اس پر ہی تمام تفریعات ہوں گی۔[1]"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب معاہدہ ہے تو پھر قومی تحریکوں میں توڑ پھوڑ مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی جو چیزیں ہوتی ہیں ان کے جواز کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ یہ سب نقضِ عہد میں داخل ہیں اور اسلام میں نقضِ عہد سخت گناہ ہے، غالباً یہی سوال حضرت شاہ صاحب کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ عبارت مذکورۂ بالا کے فوراً بعد جواباً فرماتے ہیں:-

"یہ معاہدہ پہلے جان اور مال دونوں کے متعلق تھا۔ لیکن اب جان سے متعلق معاہدہ کو ہم نے ان کے منہ پر دے مارا ہے (یعنی وہ ہماری جان کے ذمہ دار نہیں اور ہم ان کی جان کے نہیں) البتہ اموال کے بارہ میں معاہدہ اب تک باقی ہے۔ چنانچہ انگریزوں کا مال چرانا جائز نہیں ہے۔"

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری جلد ۳ ص ۴۴۹۔

Marfat.com

اور وہ بھی امن و امان کے ساتھ! مسلمانوں نے خود اپنے عہد حکومت کے گزشتہ دو سو برس میں نہیں پائی تھی۔ چنانچہ راج گوپال آچاریہ کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے ایک ظالم کی گولی کا نشانہ بننے سے دو برس پہلے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے راج میں ننانوے فی صدی آزادی رکھتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے[۱]

بہر حال مولانا محمد انور شاہ اور مولانا حسین احمد دونوں ایک ہی مکتبۂ فکر کے بزرگ اور ایک ہی استاد کے نامور شاگرد تھے لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق دونوں میں جو اس قدر شدید اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مولانا مدنی پر سیاسی انقلاب پسندی اور انگریز دشمنی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ اس معاملہ میں فقیہانہ سنجیدگی اور متانت اور تاریخ کا واقعاتی شعور مغلوب ہو جاتے تھے۔

اس کے برخلاف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جو باعتبار تفقہ اپنے تمام معاصرین میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ ان کو دیکھیے۔ آپ نے امداد الفتاویٰ میں متعدد مقامات پر ہندوستان میں سود لینے کے مسئلہ پر گفتگو کی لیکن ہندوستان کو کہیں دار الحرب نہیں لکھا۔ بلکہ آپ کا یہ ارشاد عام طور پر مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ریل کا ٹکٹ نہیں خرید سکا اور اسی حالت میں اس نے سفر بخیر و خوبی طے کر لیا تو اب اسے چاہیے کہ اتنی ہی مسافت اور اسی درجہ کا ایک ٹکٹ خرید کر چاک کر دے تاکہ گورنمنٹ کا نقصان نہ ہو۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

ہم نے یہاں تک صرف اکابر علمائے احناف کے ارشادات و بیانات پر روشنی ڈالی ہے لیکن ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کے علما بھی بڑی اہمیت کے مالک رہے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارے میں ان علمائے اعلام کی آرا اس لیے اور بھی لائق توجہ ہیں کہ اس جماعت نے ہی سب سے زیادہ سرگرمی اور جوش کے ساتھ حضرت احمد شہید کے زیر قیادت انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں حصہ لیا تھا اور اسی

---

[۱] انگریزی روزنامہ اسٹیٹسمین مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۶۶ء ص ۸ کالم ۳

بنا پر انگریز انھیں بدنام کرنے کی غرض سے وہابی کہتے تھے۔ بہرحال اس جماعت کے علما میں مولانا ابو سعید محمد حسین لاہوری (جو عام طور پر بٹالوی بھی مشہور ہیں) بلند پایہ عالم اور صاحب تصنیف وقلم بزرگ تھے۔ لاہور سے اشاعۃ السنۃ نامی ایک دینی پرچہ شائع ہوتا تھا۔ مولانا اس کے اڈیٹر اور زمانہ کے اعتبار سے سرسید احمد خاں۔ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے ہمعصر تھے۔ موصوف نے ۱۸۷۶ء میں ایک رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے نام سے لکھا تھا جو انھیں دنوں میں وکٹوریہ پریس میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں مولانا نے بڑی قوت اور زور سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان ہرگز دار الحرب نہیں ہے اور اس بنا پر انگریزوں کے خلاف جہاد جائز نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"جو مخالفین اسلام کسی کے مذہب سے تعرض کرنا جائز نہ سمجھیں اور اس امر کو خواہ بمقتضائے مداہنت خواہ بہ ہدایت مذہب خواہ بحکم عقل و اصول سلطنت بہت برا سمجھیں۔ جیساکہ برٹش گورنمنٹ کا حال وچال ہے۔ ان سے مذہبی جہاد کرنا ہرگز جائز نہیں۔"[۱]

یہ تو ہوئی جہاد کی بات! اب ملک کی شرعی حیثیت کے بارے میں سنیئے۔ فرماتے ہیں:-

"جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی حاصل ہو وہ شہر یا ملک دار الحرب نہیں کہلاتا۔ پھر اگر وہ دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہو۔ اقوام غیر نے اس پر تغلب سے تصرف پالیا ہو (جیساکہ ملک ہندوستان ہے) تو جب تک اس میں ادائے شعائر اسلام کی آزادی رہے وہ بحکم حالت قدیم دار الاسلام کہلاتا ہے کہلاتا ہے۔ اور اگر وہ قدیم سے اقوام غیر کے قبضۂ وتسلط میں ہو مسلمانوں کو انہی لوگوں کی طرف سے ادائے شعار مذہبی کی آزادی ملی ہو تو وہ بھی دار الاسلام اور کم سے کم دار السلم والامان کے نام سے موسوم ہونے کا مستحق ہے۔"[۲]

---

[۱] الاقتصاد فی مسائل الاجتہاد ص۴۱ ۔ [۲] ایضاً ص۱۹

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مولانا محمد حسین صاحب نے جو کچھ اس رسالہ میں لکھا ہے وہ اس میں منفرد نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ رسالہ کے شروع میں (صفحہ ۳ و ۴) خود انھوں نے لکھا ہے یہ رسالہ انھوں نے ۱۸۷۰ء میں لکھ لیا تھا لیکن اس کو شائع کرنے سے قبل انھوں نے علمائے اسلام کی رائیں لینے کی غرض سے لاہور سے عظیم آباد پٹنہ تک کا سفر کیا اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"اور اکابر علمائے مختلف فرقہائے اسلام کو یہ رسالہ حرف بہ حرف سنا کر ان کا توافقِ رائے حاصل کیا اور بعض بلاد ہندوستان و پنجاب میں جہاں راقم خود نہیں جا سکا۔ اس رسالہ کی متعدد کاپیاں بھجوا کر ان بلاد کے اکابر علما کا اتفاق رائے حاصل کیا"

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کس پایہ کے عالم تھے؟ ان کی تصنیفات اور ترجمۂ قرآن سے ظاہر ہے۔ ان کے نزدیک بھی ہندوستان دارالحرب نہیں تھا بلکہ اگر کسی وقت انگریزوں نے مسلمانوں کے سفر حج پر کوئی پابندی مذہبی تعصب کے بغیر کسی عام مصلحت سے لگائی تھی تو وہ ہرگز مداخلت فی الدین تھی چنانچہ لکھتے ہیں :۔

" دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جس میں کافروں کی عملداری ہو اور وہاں کا حاکم مذہبی ضد سے مسلمانوں کو فرائض اسلامی نماز روزہ حج زکوٰۃ کے بجا لانے سے روکے اور منع کرے۔ ایسے ملک میں مسلمانوں کو رہنا درست نہیں ... خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ہندوستان باوجودیکہ نصاریٰ کی عملداری ہے دارالحرب نہیں ہے اس لیے کہ یہاں بجا آوریِ فرائض میں کسی طرح کی روک ٹوک نہیں۔ اور جو طاعون کی وجہ سے حاجیوں کو سفر حجاز سے روکا جاتا ہے تو یہ روکنا حکماً نہیں بلکہ عارضی دوہ صلاح و مشورہ کے طور پر ہے اور اس سے زیادہ روک ٹوک تو مصر اور روم میں جاری ہے جہاں اسلامی حکومت ہے۔ کہ مرض طاعون متعدی ہے ایک سے اڑ کر دوسرے کو لگ جاتا ہے۔ موسم حج میں بہت سے لوگوں کا اژدہام ہوگا تو خوف ہے کہ کہیں مری نہ پھیل جائے پس اگر اس کو روک ٹوک سمجھا بھی جائے تو نہ اس لیے ہے کہ لوگ فریضۂ حج نہ ادا کریں بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے ہے کہ حاجیوں

کی جانیں ضائع نہ ہوں"۔[۱]

آزاد ہندوستان اور اس کا حکم

یہاں تک انگریزوں کے زمانے کے ہندوستان کا تذکرہ تھا۔ اب ہمیں موجودہ آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت سے بحث کرنی چاہیے۔ کیونکہ مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری نے خود اس باب میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔ "حضرت شاہ صاحب (مولانا کشمیری) نے اپنی اس تحریر میں سب سے پہلے کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کی اصل بنیاد بیان کی ہے فرماتے ہیں باید دانست کہ مدار بودن بلدہ وملکے دارالاسلام یا دارالحرب بر غلبہ مسلمانان کفا است وبس"۔ پھر اس اصول کو دلائل وشواہد اور حوالوں سے مستند و موثق فرمایا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایں اصل را خوب ذہن نشین باید کرد کہ جملہ مسائل از ہمیں اصل برمی آیند و
ہمہ جزئیات ایں باب وا ثر بر ہمیں اصل ہستند"

اس کے بعد اسی اصل پر تفریعات ہیں اور مختلف جزئیات ومسائل بیان فرمائے ہیں اور بعض شبہات کا ازالہ کیا ہے اور آخر میں ہندستان کی صورتِ حال بتلا کر اس ملک کے دارالحرب ہونے کا حکم ان الفاظ میں بتایا ہے:۔

"بہر حال تسلط کفار بر ہند بداں درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار را بر دارالحرب زیادہ نبودہ۔ واداے مراسم اسلام از مسلمانان محض باجازتِ ایشان است واز مسلمانان عاجز ترین رعایا کسے نیست"

یہ سب کچھ لکھنے لکھانے کے بعد مولانا منت اللہ صاحب غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:۔

"ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریبا چالیس برس پہلے کی ہے جبکہ انگریزوں کا دور حکومت تھا۔ اس تحریر میں دارالحرب کے لیے جو اصل بنیاد بتلائی

---

[۱] ترجمۂ قرآن حاشیۂ سورۂ نساء رکوع ۱۴۔

پیش لفظ

یہ کتاب جو آپ کے پیش نظر ہے میرے دو مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے پہلا مقالہ ۱۹۶۵ء میں مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کی خدمت میں بطور نذر پیش کرنے کے لیے جو کتاب "نذر عرشی" کے نام سے شائع ہوئی تھی اُس میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مقالہ ۱۹۶۷ء میں قسط وار مجلہ "برہان" دہلی میں چار ماہ تک شائع ہوتا رہا تھا۔

سعید احمد اکبر آبادی
۱۵ر فروری ۱۹۶۸ء

Marfat.com

گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جاسکتی ہے۔" (ص ۲)

وہ فیصلہ کن رائے کیا ہے؟ مولانا نے اگرچہ اس کو گول مول رکھا ہے لیکن اس طرح کہ

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے (غالب)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک ہندوستان دارالحرب ہے۔ پھر امیر شریعت بہار اس میں منفرد نہیں ہیں بلکہ سابق جمعیۃ علمائے ہند مولانا محمد میاں کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ ایک تحریر جو بصورتِ افتا ہے اس میں فرماتے ہیں:-

"یہ ملک (جنوبی افریقہ) یقیناً دارالحرب ہے کیونکہ مسلمان دوسرے اقتدار کے ماتحت ہیں، خود ان کی حکومت نہیں ہے۔ نہ ان کا کوئی ایسا بااختیار شرعی نظام یا کوئی ایسا نواب یا امیر شریعت ہے جس کو حکومت نے مسلمانوں کے معاملات کا اختیار دے رکھا ہو۔ ایسا ملک اصطلاح شریعت میں دارالحرب کہلاتا ہے۔"

اس کے بعد بعض کتب فقہ سے دو ایک عبارتیں نقل کی ہیں، اور پھر لکھتے ہیں:-

"اگر آپ دار کا ترجمہ اسٹیٹ (ریاست) کرلیں تو دارالاسلام اور دارالحرب کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ غیر مسلم اسٹیٹ کو دارالحرب کہا جاتا ہے اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن وحفاظت کا کوئی معاہدہ ہو یا اس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے تحت محفوظ رہیں۔ اگر وہ مسلم اسٹیٹ نہیں ہے تو وہ دارالاسلام نہیں ہے۔ بہرحال فقہ کی اصطلاح میں اس کو دارالحرب کہا جاتا ہے" (روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۶۶ء ص ۴ کالم ۱)

مولانا محمد میاں کی یہ تحریر اگرچہ جنوبی افریقہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے لیکن مذکورۂ بالا عبارت میں آپ نے دارالحرب کی جو تعریف کی اور اس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ ہندوستان کا حکم بھی آپ کے نزدیک وہی ہے جو

جنوبی افریقہ کا ہے یعنی وہ بھی دارالحرب ہے اور ہندوستان بھی دارالحرب !

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند جنوبی افریقہ کی ریاست کے بارے میں ایک سوال نامہ دارالعلوم دیوبند میں بھی موصول ہوا تھا۔ یہاں کے دارالافتاء کی طرف سے اس کا جو جواب گیا ہے اور جس پر مولوی محمد جمیل الرحمٰن نائب مفتی اور مفتی محمود احمد الصدیقی دونوں کے دستخط ہیں اور تاریخ یکم شعبان ۱۳۸۴ھ درج ہے۔ اس میں بھی کم وبیش وہی بات کہی گئی ہے جو مولانا محمد میاں نے کہی ہے اور اس سے بھی استنباط یہی ہوتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

"آپ کی (یعنی سائل کی) تحریر کے مطابق جمہوریہ افریقیہ میں مسلمان اقل قلیل ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ جمہوریہ میں غلبہ وتسلط غیر مسلموں کا ہے اور یہی مدار ہے دارالحرب ہونے کا"[1]

دارالحرب سے متعلق اوپر جو اقتباسات وبیانات نقل کیے گئے ہیں اُن کو بیک نظر دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی ملک کے دارالحرب ہونے کا دارومدار اس ملک میں غیر مسلموں کی اکثریت اور ان کے استیلاء وتسلط پر ہے۔ لیکن معاملہ فی نفسہ اس قدر آسان نہیں کہ دو چار عبارتیں فقہاء کی نقل کر کے اور اس پر دو تین جملے لکھ کر ختم کر دیا جائے۔ اس بناء پر ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث وگفتگو کریں گے اور اس سلسلے میں پہلے یہ دیکھیں گے کہ

(۱) فقہاء کے نزدیک دارالحرب کی کیا تعریف ہے۔ اس کی کیا پہچان ہے اور کیا خصوصیات ہیں؟

(۲) دار کی کتنی قسمیں ہیں؟ اور ان اقسام میں باہم کیا نسبت ہے؟ اس کے بعد اس پر غور کریں گے کہ موجودہ زمانے میں جبکہ قومیت اور وطنیت کا ایک نیا تصور پیدا ہوا ہے اور دنیا کی تمام مسلم اور غیر مسلم حکومتیں قومی اور بین الاقوامی معاملات میں اسی جدید تصور پر ملکی دساتیر حکومت میں عمل پیرا ہو رہی ہیں، اسلامی تعلیمات واحکام کی رو سے ان ممالک کا شرعی حکم کیا ہوگا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو ہندوستان کے دستور اور اس کے نظام حکومت کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا

---

[1] ماہنامہ الرحیم پاکستان بابت جون ۱۹۶۶ء ص ۴۸

بہت آسان ہو جائے گا کہ آزاد ہندوستان مسلمانوں کے لیے شرعی طور پر کس قسم کا دار ہے اور مسلم ممالک کے لیے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

دار الحرب کی تعریف اور اس کی خصوصیات

کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہا کے ذہن میں دار الحرب دو قسم کے تھے۔ ایک وہ ملک جو شروع سے دار الحرب بنے چلے آرہے ہیں اور ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اور دوسرے وہ ممالک جن کے حالات بدلتے رہتے رہے ہیں، یعنی کبھی ان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور کبھی غیر مسلموں کا۔ اور جیسا کہ ساتویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ محمد بن محمود الاستروشنی نے لکھا ہے۔ دراصل یہ دوسرے قسم کے ہی ممالک ہیں جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے تھے۔ جن کے باعث فقہا کو دار الحرب اور دار الاسلام کی تعریف کرکے ان کی حد بندی کرنی پڑی[1]

ہندوستان اگر دار الحرب ہے تو ظاہر ہے کہ پہلی قسم کا تو ہرگز ہو ہی نہیں سکتا، لا محالہ دوسری قسم کا ہی ہوگا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ فقہا کے نزدیک اس دار الحرب کی کیا تعریف اور اس کی کیا خصوصیات ہیں:۔

امام ابو حنیفہ اور صاحبین کا اختلاف

اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی ملک پر مشرکین کا قبضہ ہو جائے اور وہ اس میں احکام شرک ظاہر کرنے لگیں تو وہ ملک دار الحرب بن جاتا ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ اس پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ آپ کے نزدیک کسی ملک کے دار الحرب بن جانے کے لیے اُس میں تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ امام صاحب اور صاحبین کی یہ رائے فقہ حنفی کی سب ہی مشہور کتابوں میں مذکور ہے۔ ہم صرف مبسوط للسرخسی سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں:۔

---

[1] کتاب الفصول ج ۱ ورق ۲ مخطوطہ دار العلوم دیوبند۔ مصنف جن کا انتقال ۶۳۲ھ میں ہوا ہے۔ ماوراء النہر کے اکابر مجتہدین و فقہا میں سے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جو بڑی پایہ کی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا تذکرہ کشف الظنون ص ۴۸ میں ہے، اور مولانا عبد الحی لکھنوی نے الفوائد البہیۃ مطبوعہ مطبع مصطفائی لکھنؤ میں صفحہ ۸۲ و ۸۳ پر بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

Marfat.com

والحاصل أن عند ابي حنيفة
انما تصير دارهم دار الحرب
بثلاث شرائط احدها أن تكون
متاخمة ارض الترك ليس بينها
وبين ارض الحرب دار للمسلمين
الثاني ان لا يبقى فيها مسلم آمن
بأمانه ولا ذمي آمن بامانه. الثالث
ان يظهروا أحكام الشرك فيها
وعن ابي يوسف ومحمد اذا اظهروا
احكام الشرك فيها فقد صارت
دارهم دار حرب[1]

غرض کہ ابوحنیفہ کے نزدیک غیر مسلموں کا ملک تین شرطوں سے دارالحرب بنتا ہے (۱) ایک یہ کہ یہ ملک تاتاریوں (اس وقت تک یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے ملک سے ملا ہوا ہو یعنی اس ملک اور ارض حرب میں مسلمانوں کا کوئی ملک نہ ہو۔ (۲) دوسری یہ کہ اس میں کوئی مسلمان سابق امان کے ساتھ نہ ہو اور اسی طرح کوئی ذمی سابق امان کے ساتھ نہ ہو۔ (۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ لوگ شرک کے احکام ظاہر کریں۔ اس کے برخلاف ابو یوسف اور ابو محمد کے نزدیک احکام شرک کے ظاہر کرتے ہی یہ ملک دارالحرب بن جاتا ہے۔

اس عبارت اور اسی جیسی دوسری عبارتوں سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ صاحبین کے نزدیک محض احکام شرک کے اظہار سے ملک دارالحرب بن جاتا ہے اور اس کے برخلاف امام ابوحنیفہ کی رائے میں کوئی ملک اس وقت تک دارالحرب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں شرائط سہ گانہ ایک ساتھ نہ پائی جائیں اس بنا پر یہ اختلاف حقیقی ہے اور چونکہ امام صاحب کے شرائط سہ گانہ میں خود صاحبین کی شرط داخل ہے اس لیے ان دونوں مسلکوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے یعنی جو ملک امام صاحب کے مسلک پر دارالحرب ہوگا وہ صاحبین کے مسلک پر بھی ہوگا۔ لیکن جو ملک صاحبین کے نزدیک دارالحرب ہو ضروری نہیں ہے کہ امام صاحب کے نزدیک بھی ایسا ہی ہو لیکن اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اختلاف حقیقی نہیں بلکہ صرف نزاع لفظی ہے، کیونکہ صاحبین محض اظہار احکام شرک کو جو دارالحرب ہونے کی بنیاد قرار دیتے ہیں تو یہ مطلق نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر شخص کو مذہب کی آزادی حاصل ہوتی ہے چنانچہ مسلمان

---

[1] المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۱۱۴ باب المرتدین۔

Marfat.com

بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان میں بھی تھی، اور اس حد تک تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر ایسے متقشف اور متصلب فی الدین فرمانروا کے خزانۂ شاہی سے مندروں کے لیے باقاعدہ گھی اور تیل مہیا کیا جاتا تھا اور مندروں کے پجاریوں اور پنڈتوں کے ماہانہ وظیفے اور روزینے مقرر تھے۔ چند سال ہوئے صرف ایک شہر اجین سے عالمگیر کے ایسے چالیس فرمان دستیاب ہوئے تھے جن میں وہاں کے مہنتوں اور پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ پس جب احکام شرک کا ظہور اسلامی حکومت کے ماتحت دارالاسلام میں بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے تو احکام شرک کا مطلقاً اظہار دارالحرب ہونے کی بنیاد کیونکر قرار پا سکتا ہے؟ اس بنا پر لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اظہار احکام شرک سے صاحبین کی مراد اہل شرک کا قہر و غلبہ اور ایسا استیلا و استبداد ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی شعائر پر قائم رہنے اور مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی نہ رہے اور وہ اس معاملہ میں مقہور و مغلوب ہو جائیں۔ امام صاحب نے 'اظہار احکام شرک' جو اُن میں اور صاحبین میں مشترک شرط ہے۔ اس کے علاوہ باقی جو دو شرطیں اور مقرر کی ہیں وہ درحقیقت اسی استیلاء یا قہر و غلبۂ اہل شرک کی علامتیں ہیں نہ کہ مستقل کوئی دو جداگانہ چیزیں۔ اس تجزیہ کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ امام صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل اسی ایک چیز کی توضیح اور تشریح ہے جسے صاحبین نے صرف ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہی اسی فتوے زیر بحث میں فرماتے ہیں:۔

الحاصل ایں اصل کلی و قاعدۂ کلیہ	خلاصہ یہ ہے کہ قاعدۂ کلیہ اس باب میں یہ
است کہ دارالحرب مقہور کفار است	ہے کہ دارالحرب وہ ہے جو مقہور کفار ہو اور دارالاسلام
و دارالاسلام مقہور اہل اسلام اگرچہ	وہ ہے جو مقہور اہل اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار
در یک دار دیگر فریق ہم موجود باشد	میں دوسرے دار کے لوگ بھی بدون غلبۂ قہر
بلا غلبہ و قہرش آں جا کہ قہر ہر دو فریق	کے آباد ہوں اور جس ملک پر دونوں فریق کا
باشد آں ہم دارالاسلام خواہد بود[1]	تسلط ہو وہ بھی دارالاسلام ہی سمجھا جائے گا۔

---

[1] فیصلۃ الاعلام فی دارالحرب و دارالاسلام ص ۴، ۵

Marfat.com

اس عبارت سے نتیجہ یہ نکلا کہ ملک تین قسم کے ہیں :۔

(الف) جس پر غیر مسلموں کا ایسا قبضہ ہو کہ مسلمانوں کو اس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔

(ب) جس پر مسلمانوں کا ایسا قبضہ ہو کہ غیر مسلموں کو اس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔

(ج) جس پر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اقتدار اور تسلط حاصل ہو۔

ان تینوں میں پہلا ملک دار الحرب ہوگا اور باقی دونوں دار الاسلام کہلائیں گے۔

استیلاء تام کی حقیقت

پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ دار الحرب ہونے کا دار و مدار غیر مسلموں کے استیلاء تام اور ان کے بے شرکت غیرے غلبہ و قہر پر ہے تو اب دیکھنا یہ چاہیے کہ فقہاء کے نزدیک اس استیلاء اور غلبہ و قہر کا تحقق کب ہوتا ہے؟ اور اس کا معیار کیا ہے؟

فقہا نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ استیلاء صرف اس صورت میں متحقق ہوتا ہے جبکہ ملک کے نظم و نسق میں مسلمانوں کو کوئی کسی قسم کا عمل دخل نہ ہو اور ان کو مذہبی آزادی بھی حاصل نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو نظم و نسق میں دخل ہے یا دخل تو نہیں ہے لیکن مذہبی آزادی بہر حال حاصل ہے۔ ان دونوں صورتوں میں "استیلاء" متحقق نہیں ہوگا اور اس بنا پر وہ ملک شریعت کی اصطلاح میں دار الحرب نہیں کہلائے گا۔

اب ہم فقہاء کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جن سے ہم نے استیلاء کے مفہوم اور حقیقت کی تعیین و تشخیص میں یہ جو کچھ کہا ہے اس کی تائید ہوگی۔ بدائع الصنائع میں ہے:

إن الأمان ان كان للمسلمين فيها على الاطلاق والخوف للكفرة على الاطلاق فهي دار الاسلام وان كان الأمان فيها للكفرة على الاطلاق والخوف للمسلمين على الاطلاق فهي دار الكفر[1]	اگر ملک میں مسلمانوں کو مطلق امان اور کفار کو مطلق خوف ہو تو وہ دار الاسلام ہے اور اگر اس کے برعکس مکمل امان کفار کو ہو اور مطلق خوف مسلمانوں کو تو وہ دار الحرب ہے۔

---

[1] جلد ۷ ص ۱۳۱

Marfat.com

یہ صورت ہوئی استیلائے تام کی۔ اب لیجیے وہ دو صورتیں جن سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ تو ان میں سے پہلی یہ ہے کہ نظم و نسق میں دخل ہو، اس سلسلہ میں در المختار میں ہے:۔

لو اجریت احکام المسلمین	اگر مسلمانوں اور اہل شرک دونوں کے
واحکام اھل الشرک لاتکون	احکام جاری ہیں (یعنی وہاں کی حکومت
دار حرب [1]	مشترکہ ہے) تو وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مذکورہ بالا عبارت میں صرف حکومت یا اقتدار میں شرکت کا ذکر ہے اس چیز کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ شرکت کس درجہ کی ہے۔ اس بنا پر اگر کسی ملک میں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو تب بھی وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا!

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی جو جنگ آزادی میں جمعیۃ علما کے سب سے بڑے سپہ سالار اور میر کارواں تھے اس وسوسہ یا شبہ سے کیونکر خالی الذہن ہو سکتے تھے؟ چنانچہ آپ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوے پر کلام کرتے ہوئے صاف لفظوں میں تحریر فرمایا کہ:

"اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہر حال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لیے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔" [2]

اب رہی دوسری صورت یعنی یہ کہ مسلمان نظم و نسق مملکت میں کوئی عمل دخل نہ رکھتے ہوں لیکن ان کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو ایسے ملک کے دارالحرب نہ ہونے کا اولین ماخذ ہجرت حبشہ ہے جو نبوت کے پانچویں برس وقوع پذیر ہوئی تھی۔ یہاں مسلمان مہاجرین و مہاجرات کو جو امن و امان اور آرام و اطمینان ملا صحابۂ کرام نے اس پر شکر کا اظہار اس طرح کیا کہ اب

---

[1] جلد ۳ ص ۲۷۵ [2] نقش حیات ج ۲ ص ۱۱

دنوں میں نجاشی کے ملک پر کسی دشمن نے حملہ کیا اور خود نجاشی اس کے لیے میدان میں اُترا تو ان صحابہ نے نجاشی کی فتح کے لیے دعا کی اور جنگ کے لیے خود اپنی خدمات پیش کیں[1]۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا ماخذ یہ ہے کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ہمیں کسی قبیلہ سے جنگ کرنے کے لیے بھیجتے تھے تو ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ اگر تمھیں اس قبیلہ میں کوئی مسجد نظر آئے یا وہاں سے اذان کی آواز سنائی دے تو اس پر حملہ نہ کرنا[2]۔

ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قبیلہ کے ساتھ غزوہ کرنے کے لیے اپنے آدمی بھیجے ہیں اس کی عظیم اکثریت غیر مسلموں پر ہی مشتمل ہوگی۔ پھر اگر اس آبادی سے اذان کی آواز آتی یا وہاں کی کوئی مسجد نظر آتی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اکّا دکّا مسلمان بھی آباد ہیں اور انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ محض اس بنا پر حضورؐ کا اس قبیلہ کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا حکم دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان تعداد میں کتنے ہی کم ہوں، لیکن اگر ان کو مذہبی آزادی حاصل ہے تو اب یہ علاقہ "دارالحرب" نہیں رہا۔ ان دونوں ماخذوں کا اطلاق ان علاقوں پر ہوتا ہے جو اب تک دارالاسلام نہیں بنے ہیں، لیکن جو علاقہ ایک مرتبہ دارالاسلام بن چکا ہے اس کے دارالحرب نہ بننے کے ثبوت میں فقہا نے ان دو ماخذوں کے علاوہ دو دلیلیں اور پیش کی ہیں، ایک یہ کہ جس حکم کا وجود کسی علت پر مبنی ہوتا ہے تو جب تک وہ علت بالکلیہ مرتفع نہیں ہو جائے گی حکم مرتفع نہیں ہوگا۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلی۔ اس بنا پر جس ملک میں بھی اسلامی زندگی کے تھوڑے بہت آثار و علائم موجود ہیں وہ دارالحرب نہیں ہو سکتا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کو ذہن میں رکھ کر اب آپ خود فقہا کی زبان سے ان کے بیانات سُنیئے:۔

سرخسی فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایک ملک جو دارالاسلام رہ چکا ہے وہ دارالحرب

---

[1] سیرۃ النبی، مولانا شبلی ج ۱ ص ۲۴۰

[2] مسند امام احمد بن حنبل ترتیب ساعاتی ج ۱۴ ص ۵۹۔ یہ روایت بخاری، ابوداؤد اور ترمذی میں بھی سند کے اختلاف کے ساتھ ہے۔

اس وقت بنتا ہے جبکہ وہاں مشرکین کو مکمل قہر اور غلبہ ہو۔ اور مکمل قہر اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ایک مسلمان یا ذمی بھی مامون نہ ہو۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

ان بقی فیھا مسلمٌ او ذمی آمنٌ فذالك دلیل عدم تمام القھر منھم[1]

اگر اس ملک میں ایک مسلمان یا ذمی بھی مامون (بامانِ سابق) ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ مشرکوں کو اس ملک میں مکمل قہر و غلبہ حاصل نہیں ہے۔

صاحب درمختار ملتقی الابحر کی شرح میں لکھتے ہیں:

ولا تصیر دار الاسلام دار الحرب الا بامور ثلاثۃ: باجراء احکام الشرك۔ وباتصالھا بدار الحرب وبان لا یبقی فیھا مسلمٌ او ذمی بالامان الاول[2]

اور کوئی دار الاسلام اس وقت تک دار الحرب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں تین چیزیں ایک ساتھ نہ پائی جائیں (۱) وہاں احکام شرک جاری ہوں۔ (۲) وہ دار الحرب سے متصل ہو (۳) اور اس میں ایک مسلمان اور ذمی بھی امانِ سابق سے نہ رہتا ہو۔

محمد بن محمود الاستروشنی لکھتے ہیں:-

وابو حنیفۃ یقول: ان ھذہ البلدۃ صارت دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فیھا فما بقی شئیٌ من احکام الاسلام فیھا یبقی دار الاسلام علی ما عرف ان الحکم اذا ثبت بعلۃ فما بقی شئیٌ من احکام العلۃ یبقی الحکم ببقائہ[3]

اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں: "یہ ملک احکام اسلام کے جاری ہونے سے دار الاسلام ہو گیا تھا تو اب جب تک اس میں اسلام کا کوئی ایک حکم بھی موجود ہے، وہ دار الاسلام ہی رہے گا۔ کیوں کہ یہ معلوم ہے کہ جب کوئی حکم ثابت ہو جاتا ہے تو جب تک علت کا کچھ حصہ بھی باقی رہتا ہے اس کی بقاء سے حکم بھی باقی رہتا ہے۔

---

[1] المبسوط للسرخسی باب المرتدین ج ۱۰ ص ۱۱۴۔

[2] الدر المنتقی فی شرح الملتقی مخطوطۂ دار العلوم دیوبند ص ۲۵۵۔

[3] کتاب الفصول ج ۱ ورق مخطوطۂ دار العلوم دیوبند۔

اس کے بعد شرح سیر الاصل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابو بکر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:

ان دار اسلام یصیر دار الحرب اذا بقی شیٔ من احکام الاسلام وان زالت غلبۃ اهل الاسلام

دار الاسلام اس وقت تک دار الحرب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں اسلامی احکام میں سے کچھ بھی باقی ہو۔ اگرچہ اہل اسلام کا غلبہ نہ رہا ہو۔

پھر صدر الاسلام ابو الیسر کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ:

دار الاسلام لا یصیر دار الحرب ما لم یبطل جمیع ما بہ صارت دار الاسلام

دار الاسلام اس وقت تک دار الحرب نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب چیزیں فنا نہ ہو جائیں جن کے باعث وہ ملک دار الاسلام بنا تھا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

وذکر شیخ الاسلام الاسبیجابیؒ فی مبسوطہ ان دار الاسلام محکومۃٌ بکونها دار الاسلام فیبقی هذا الحکم ببقاء حکم واحدٍ فیها وذکر الامام اللامسی فی واقعاتہ ان صارت دار الاسلام بهذہ الاعلام الثلاثۃ فلا تصیر دار الحرب ما بقی شیٔ منها۔ وذکر الشهید الامام الاجل ناصر الدین فی المنشور ان دار الاسلام صارت دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فما بقیت علقۃٌ من علائق الاسلام ترجح جانب الاسلام وذکر فی الملتقط

اور شیخ الاسلام الاسبیجابیؒ نے اپنی مبسوط میں بیان کیا ہے کہ جب دار الاسلام پر دار الاسلام ہونے کا حکم لگ گیا تو اب اگر ایک اسلامی حکم بھی باقی رہے گا تو یہ دار الاسلام ہونے کا حکم بھی باقی رہے گا اور امام لامسی نے اپنے واقعات میں بیان کیا ہے کہ ایک ملک جب تینوں علامتوں کے باعث دار الاسلام ہو گیا تو اب جب تک ان علامتوں کا ایک شمہ بھی باقی ہے یہ ملک دار الحرب نہیں ہو گا۔ اور شہید امام اجل ناصر الدین نے منشور میں لکھا ہے کہ ایک ملک جو احکام اسلام کے اجراء سے دار الاسلام بن گیا ہے تو جب تک کسی قسم کا لگاؤ اس کو اسلام سے رہے گا جانب اسلام کو ہی ترجیح رہے گی اور انھیں نے

Marfat.com

ان البلاد التي في ايدي الكفار لا شك انها بلاد الاسلام لا بلاد الحرب لانها غير متاخمة لبلاد الحرب ولانهم لم يظهروا فيها احكام الكفر [1]

ملتقط میں بیان کیا ہے کہ جو علاقے کفار کے قبضہ میں ہیں وہ بے شبہ اسلامی علاقے ہیں نہ کہ حربی۔ کیوں کہ یہ علاقے بلاد حرب سے متصل نہیں ہیں اور پھر ان علاقوں کے حکمرانوں نے ان میں احکام کو غالب نہیں کیا ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں میں آپ نے ملاحظہ فرمایا فقہائے کرام برابر یہ کہتے جا رہے ہیں کہ اگر اسلام کا ایک حکم بھی باقی ہوگا تو ملک دار الحرب نہیں ہوگا، اب یہ بھی سن لیجیے کہ یہ ایک حکم جس کا تقاضا "عدم اظہار کفر" دلیل ہے فقہا کے نزدیک اس کا معیار اور اس کی حد کیا ہے؟ یہی محمد بن محمود الحنفی الاستروشنی فرماتے ہیں:

یجوز فیه اقامة الجمعة والاعیاد وتزویج الایامی [2]

اس ملک میں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا اور بیوہ عورتوں کا نکاح کرنا جائز ہو۔

اسی سلسلہ میں فتاوی بزازیہ میں ہے:

واما البلاد التي عليها ولاة كفار فيجوز فيها ايضاً اقامة الجمع والاعياد والقاضي قاضٍ بتراضي المسلمين وقد تقرر ان ببقاء شيء من العلة يبقى الحكم وقد حكمنا بلا خلاف فان هذه الديار قبل استيلاء الكفار كان من ديار الاسلام وبعد استيلاء هم اعلان الاذان والجمع والجماعات والحكم بمقتضى الشرع والفتوى والتدريس شائع بلا نكير

اور جن علاقوں پر حاکم کفار ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا گوارا ہے اور خود مسلمانوں کی آپس کی رضامندی سے وہاں قاضی بھی ہے اور یہ ثابت ہے کہ علت کے ایک جز کے بقا سے حکم باقی رہتا ہے اور ہم نے بلا خلاف کے یہ حکم کیا تھا کہ کفار کے استیلا سے پہلے یہ علاقے دار الاسلام تھے اور ان کے استیلا کے بعد اذان دینا، جمعہ اور جماعت اور شریعت کے مطابق حکم دینا فتویٰ دینا اور درس دینا عام طور پر مروج اور کفار کے بادشاہو

---

[1] کتاب الفصول ج ۱ ورق ۲ ـ [2] ایضاً

Marfat.com

من ملوکھم فالحکم بانھا من دار الحرب لاجھة لہ نظرا الی الدراسیة والدرایة۔ واعلان بیع الخمور واخذ الفرائب والمکوس والحکم من النقص برسم التتار کاعلان بنی قریظة بالیھودیة وطلب الحکم من الطاغوت فی مقابلة محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی عھدہ بالمدینة ومع ذالک کانت بلدة اسلام بلاریب۔[1]

کی طرف سے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے اس بنا پر ان علاقوں کو دار الحرب کہنے کی کوئی وجہ نہ عقلی ہے اور نہ نقلی اور شراب کا کھلم کھلا بیچنا اور خراج لینا اور ٹیکس وصول کرنا اور تاتاریوں کی رسم کا توڑنا ان سب کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ بنو قریظہ کا اعلان یہودیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں طاغوت سے حکم کا طلب کرنا حضورؐ کے عہدِ مدنی میں اور بلا شبہ ان سب چیزوں کے باوجود مدینہ بلاشبہ اسلام کا شہر تھا۔

فقہائے کرام کی ان تمام تصریحات کو سامنے رکھنے سے جو نتیجہ بلا کسی دغدغہ اور خدشہ کے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ صرف وہ ملک دار الحرب ہوگا جہاں کفر کا غلبہ اور استیلا باین معنی ہو کہ نہ تو مسلمان اُس کی حکومت اور نظم ونسق میں شریک ہوں اور نہ ان کو مذہبی آزادی حاصل ہو یعنی یہ دونوں چیزیں استیلاء وغلبہ کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اس بنا پر یہ دونوں نہ ہوں یا ان میں سے ایک نہ ہو بہرحال فوت الجزء فوت الکل کے قاعدہ کے مطابق استیلا متحقق نہیں ہوگا اور اس لیے حسب ذیل دونوں قسم کے ملک دار الحرب نہیں ہوں گے:

(الف) وہ ملک جس میں مسلمان شریک حکومت ہیں۔

(ب) وہ ملک جس میں مسلمان شریک حکومت تو ہیں نہیں البتہ انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔

احتمال عقلی کے طور پر ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان شریک حکومت تو ہیں مگر ان کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے لیکن ہم نے اس صورت کا ذکر قصداً اس لیے نہیں کیا کہ اگر واقعی کسی ملک میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو مذہبی آزادی کے نہ ہونے باوجود حکومت میں شریک ہیں

---

[1] بحوالہ اردو ترجمہ مجموعة الفتاوی مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحی لکھنوی جلد اول ص ۱۲۴

Marfat.com

تو وہ سچ مچ اس شعر کا مصداق ہیں :-

اپنے ہاتھوں سے جو ڈھا آئیں خدا کے گھر کو　　　ننگ اسلام ہے ایسوں کا مسلماں ہونا

اور ظاہر ہے اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ملک دار الحرب ہے یا دار الاسلام !

ہندوستان کی دستوری پوزیشن

اب آئیے ہندوستان کی دستوری پوزیشن کا جائزہ لیں ۔

اس پر غور کرنے سے پہلے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے آزادی کے اس پس منظر کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ ملک کی آزادی کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ ایک عرصہ تک سرگرم عمل رہے ۔ دونوں نے یکساں قربانیاں دیں ، جیل گئے ، پٹے اور مارے گئے ، جمعیۃ علما جو علمائے ہند کی نمائندہ جماعت تھی اس نے آخر دم تک کانگریس کا ساتھ نہیں چھوڑا ۔ اور یہ سب کو معلوم ہے کہ کانگریس کا نصب العین آزادی کے بعد جمہوری نظام قائم کرنا شروع سے رہا ہے اور علماء اس پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے رہے ہیں ۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے بعد علمائے کرام کے نزدیک ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہوتی ؟ وہ دار الحرب رہتا یا دار الاسلام ؟ اگر دار الحرب ہوتا تو کیا علماء کے لیے جائز تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کو جو (انگریزوں کے زمانہ میں) دار الحرب نہیں تھا اسے عظیم الشان قربانیاں دے کر دار الحرب بنائیں ؟ اور اگر وہ دار الاسلام بنتا تو پھر تقسیم نے ملک میں اکثریت واقلیت کے اعتبار سے آخر ایسی کونسی بنیادی تبدیلی پیدا کی ہے جس کے باعث ملک اگر تقسیم نہ ہوتا تو دار الاسلام ہوتا اور اب تقسیم ہو گیا ہے تو یہ دار الحرب بن گیا ۔ آخر دستوری طور پر وہ کونسی چیز ہے جو تقسیم نہ ہونے کی صورت میں ہوتی اور اب نہیں ہے اور اس بنا پر پہلی صورت میں شرعی حکم کچھ اور ہوتا اور اب کچھ اور ہوگا ! صوبائی طور پر آبادی کم و بیش ہوتی لیکن مرکز میں پوزیشن تو بہر حال یہی ہوتی جس کا ذکر مسلم لیگ بار بار کرتی تھی ۔

بہر حال کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مسائل پر سمجھوتہ نہ ہو سکا اور انجام کار دو قومی نظریہ پیدا ہوا اور اس کی بنیاد پر ہی ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اسی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دیا گیا ۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم سے بعد ہندو مسلمانوں میں جو نہایت شدید قسم کی منافرت ، دشمنی اور عداوت پائی جاتی تھی وہ اور پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں

جن کے پیش نظر غالباً یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں پارلیمنٹری نظام جمہوریت اختیار کیا گیا۔

جمہوریت اس نظام کے ماتحت ہر شخص جو ہندوستانی ہے مذہب، ذات پات، رنگ نسل کے اختلاف کے باوجود یکساں شہری حقوق رکھتا ہے۔ پیشوں میں، ملازمتوں میں، عہدوں میں غرض کسی ایسی چیز میں جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہے مذکورہ بالا چیزوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا، ہر شخص جو بالغ ہے اس کو رائے دینے کا حق ہوگا۔ شہری حقوق اس ملک کے ہر باشندہ کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔ عام حق رائے دہندگی (ADULT FRANCHISE) کے ذریعہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا انتخاب ہوگا۔ اور یہی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں گورنمنٹ بنائیں گی، اور اس طرح جو گورنمنٹ بنے گی اس کی تشکیل میں تمام اہالیان ملک کا دخل ہوگا۔ گویا اصل طاقت بلا اختلاف مذہب و ملت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں حکومت کے منصب پر بٹھا سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے الگ بھی کر سکتے ہیں۔

مذہبی آزادی اب لیجیے مذہبی آزادی! اس سلسلہ میں دستور اعلان کرتا ہے کہ

(۱) ہندوستان کے سب لوگوں کو مساویانہ طور پر عقیدہ (CONSCIENCE) کی آزادی کا حق ہوگا اور ان کو اس بات کا حق بھی ہوگا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس مذہب کو چاہیں مانیں، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں۔

(۲) ہر مذہبی فرقہ یا طبقہ کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مذہبی اور خیراتی کاموں کی خاطر (الف) ادارے قائم کریں اور چلائیں۔ (ب) مذہبی معاملات میں اس کا وہ خود انتظام کریں (ج) اس ادارہ کے لیے منقولہ یا غیر منقولہ جائداد حاصل کریں۔ (د) اور اس جائداد کا انتظام قانون کے مطابق وہ خود کریں [۲]

جب یہ دفعات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئیں تو اقلیتی فرقوں کے نمائندوں کی طرف

---

(1)THE CONSTITUTION OF INDIA PART III ARTICLES 14-8

(2) PART III - ARTS 25,26

Marfat.com

سے ان کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا "جناب! یہ ہے اکثریت کا وہ عادلانہ اور مساویانہ برتاؤ جو اقلیتوں کو ان کے ساتھ دو قالب و یک جان بنا دے گا۔" ایک اور صاحب نے کہا: "میں اکثریتی فرقہ کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اقلیتی فرقوں کے ساتھ بڑے عدل اور انصاف سے کام لیا ہے۔"[۱]

دستور نے صرف یہی اعلان نہیں کیا ہے کہ ہر شخص کو مذہبی عقائد و اعمال اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہوگی بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ "حکومت مذہب کے معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہوگی اور اس بنا پر حکومت کے فنڈ سے جو تعلیمی ادارے چلیں گے اُن میں کسی مذہب کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا۔"[۲]

اقلیتوں کو طبعی طور پر یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ان کے بچے حکومت کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا کر کہیں ارتداد (INDOCTRINATION) کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس دفعہ سے اس اندیشہ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سپریم کورٹ

اب سوال یہ ہے کہ دستورِ ہند نے باشندگانِ ملک کو جو یہ حقوق دیے ہیں ان کی حفاظت و نگرانی کون کرے گا۔ اور پھر اگر کسی دفعہ کی یا اس کے کسی لفظ کی مراد اور اس کی تشریح میں اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ جواب یہ ہے کہ دستور نے یہ سب اختیارات سپریم کورٹ کو دیے ہیں۔[۳] اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت اور پارلیمنٹ یہ سب دستور کے وفادار اور اس کے پابند ہیں اور دستور کی تشریح و توضیح اور ظلم و زیادتی سے اس کی حفاظت، یہ سب سپریم کورٹ کا حق ہے اور اس بنا پر گورنمنٹ بھی مجبور ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں انڈین سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس آنریبل کوکاسب راؤ (COKA SUBBA RAO) نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ "سپریم کورٹ کا فرض یہ ہے کہ

---

[۱] CONSTITUENT ASSEMBLY DELEATES VOLUM VII PAGES 260-267

[۲] ARTICLE 2.8

[۳] ARTICLE 32

Marfat.com

دستور نے جو بنیادی حقوق دیے ہیں کورٹ ان کے اور سماجی انصاف کے درمیان تطبیق و توازن رکھے اور ہیئت منتظمہ (حکومت) کو راہ سے بے راہ نہ ہونے دے۔" اسی بنا پر سپریم کورٹ کے غیر جانبدار اور بے خوف ہونا ضروری ہے۔[1]

دستور کا عملی پہلو

اب غور کیجیے۔ دستور کی دفعہ جو شہری حقوق سے متعلق ہے وہ مسلمانوں کو حکومت کے کاروبار میں اکثریت کے ساتھ شریک کرتی ہے اور مذہبی آزادی سے متعلق جو دفعہ ہے وہ ان کو مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی شعائر و رسوم کو بجا لانے کی، مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی، مذہبی تعلیم اور دینی امور کو سرانجام دینے کی غرض سے خود اپنے ادارے قائم کرنے اور ان کو حکومت کی مداخلت کے بغیر چلانے کی پوری آزادی دیتی ہے۔ شہری حقوق میں معاشی آزادی بھی شامل ہے اور اس لیے مسلمانوں کو اس بات کی بھی پوری آزادی حاصل ہے کہ حصول معاش کے لیے وہ جو پیشہ چاہیں اختیار کریں، ملازمت، صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت ان میں سے ہر ایک کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے اور کسی اعتبار سے کہیں کسی جگہ اکثریت و اقلیت میں کوئی کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے، چنانچہ جہاں تک حکومت میں مسلمانوں کی شرکت کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ صدر جمہوریہ اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، تو نائب صدر ایک مسلمان ہے۔ اسی طرح مرکز اور ریاستوں کی وزارتوں میں، سفارتوں میں، گورنروں میں، حکومت کے دفاتر میں چھوٹے ہوں یا بڑے، پارلیمنٹ میں، اسمبلیوں، عدالتوں میں، کارخانوں اور کمپنیوں میں، یونیورسٹیوں میں، ہر جگہ مسلمان موجود ہیں، حکومت کی تشکیل میں ان کے ووٹ کا بھی دخل ہوتا ہے، بلکہ بعض علاقوں میں تو ان کا ووٹ پاسنگ کی حیثیت رکھتا یعنی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اب رہی مذہبی آزادی! تو اس آزادی کی کون سی قسم ہے جو انھیں حاصل نہیں ہے۔ ملک میں لاکھوں مسجدیں ہیں جہاں سے پانچوں وقت اذان کی آواز بلند ہو کر فضا میں گونجتی ہے۔ بعض بڑے بڑے شہروں کی خاص خاص مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہے اور اس پر اذان ہوتی ہے، عید، بقرعید اور بعض اور مسلم تہواروں کی تعطیل حکومت کے کیلنڈر میں شامل ہے۔ ہر سال حج کے لیے کم و بیش سترہ اٹھارہ ہزار مسلمان حج کو جاتے ہیں اور اس

---

[1] DAILY STATESMAN, 28 TH JUNE, 1966, P.5.

Marfat.com

مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لیے سہولتیں پیدا کرنے کے سلسلہ میں گورنمنٹ وہ سارے کام کرتی ہے جو اسلامی حکومتیں کرتی ہیں۔ حکومت کی مقرر کردہ دو مرکزی حج کمیٹیاں ہیں۔ جدہ میں ہندوستانی سفارت خانہ پورے عملہ کے ساتھ حاجیوں کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت کرتا ہے۔ مکہ اور مدینہ میں اور حج کے دنوں میں منیٰ اور عرفات میں ڈاکٹروں، لیڈی ڈاکٹروں اور دواؤں کا انتظام ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف صوبوں سے حجاج کی عام خدمت کے لیے اسکاؤٹس الگ جاتے ہیں، اس سال زرمبادلہ کے سخت گھاٹے کے باوجود حکومت نے دو کرور روپیہ کا ایکسچینج حاجیوں کے لیے منظور کیا، پھر مسلمانوں کی مذہبی اور دینی تعلیم بالکل آزاد ہے، ملک میں چھوٹے بڑے سیکڑوں مدارس عربیہ اور ہزاروں مکاتب دینیہ ہیں جو بغیر کسی مداخلت کے اپنا کام کررہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند جس کا بجٹ تقسیم سے پہلے اسّی نوے ہزار ہوتا تھا اس سال اس کا بجٹ دس لاکھ روپیہ کا ہے۔ علاوہ ازیں حیدرآباد کا دائرۃ المعارف جو اسلامی علوم وفنون کی اشاعت کا سب سے اہم ادارہ ہے وہ اور اس کے علاوہ کلکتہ، پٹنہ اور رامپور وغیرہ کے مدارسِ عربیہ تمام تر حکومت کے خرچ اور اس کے انتظام سے چل رہے ہیں، سنسکرت کی طرح عربی اور فارسی کے کسی ایک اسکالر کو بھی ہر سال صدر جمہوریہ کی طرف سے اعزاز ملتا ہے تبلیغی جماعت، اسلامی جماعت اور دینی تعلیمی کونسل سب اپنے اپنے طریقہ پر کام کررہی ہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں۔

تقریر اور تحریر کی آزادی

ہمارا دستور اظہار مافی الضمیر کی گارنٹی دیتا ہے تو مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ یہاں کا مسلم پریس جس آزادی اور بے باکی کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات ومسائل اور ان کی شکایات وتکالیف کے بارے میں لکھتا اور حکومت پر تنقید کرتا ہے۔ بلاشبہ عرب اور افریقہ کے بہت سے مسلم ممالک کے اخبارات یہ جرأت و جسارت نہیں دکھا سکتے۔

معاشی آزادی

دستور معاشی آزادی کی جو ضمانت کرتا ہے مسلمان اس سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ملک میں گھوم پھر کر دیکھیے اللہ کے فضل وکرم سے صنعت وحرفت، تجارت، زراعت وفلاحت ان میں سے کوئی شعبہ نہیں ہے جس میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہو اور وہ ترقی نہ کررہے ہوں۔ تقسیم کے بعد بتاشہ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ لیکن اب وہ ایک نئی توانائی اور خود اعتمادی

Marfat.com

کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔ ان کے اپنے مل بھی ہیں اور کارخانے بھی۔ بعض خاص خاص صنعتوں کے دائرہ میں اب تک ان کے نام کا سکہ چلتا ہے، ان میں کروڑپتی بھی ہیں اور لکھ پتی بھی، چھوٹے دکان دار بھی ہیں اور بڑے بھی، مال درآمد بھی کرتے ہیں اور برآمد بھی، پھر کثرت سے فارم اور باغات والے بھی ہیں جو اپنے یہاں کی خصوصی پیداوار پر گورنمنٹ سے کئی کئی انعام لے چکے ہیں۔

شکایات اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے شکایات بھی ہیں اور بعض بہت شدید قسم کی۔ لیکن منطق کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہم ایک سالبہ بناتے ہیں اور وہ یہ کہ "مسلمانوں کے ساتھ کوئی انصاف نہیں ہو رہا ہے" لیکن کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کلیہ صحیح ہے پس جب یہ صحیح نہیں تو لامحالہ اس کی نقیض یعنی موجبہ جزئیہ صحیح ہوگی اور اب یہ قضیہ یہ ہوگا کہ "مسلمانوں سے کچھ انصاف ہو رہا ہے اور کچھ نہیں ہو رہا ہے"! اب دیکھنا یہ ہے کہ مکمل انصاف اور دستور پر مکمل عمل کس کے حق میں ہو رہا ہے؟ آج آپ کو معلوم ہے ملک کا کیا حال ہے؟ کون سی بیماری ہے جو ہمارے سماج میں نہیں ہے۔ کون سا آزار ہے جس میں ہمارا معاشرہ مبتلا نہیں۔ روگ کی وہ کون سی قسم ہے جو قوم کے رگ و پے میں سارى نہیں۔ آدمی پاگل ہوتا ہے تو ماں باپ اور بہن بھائی پر بھی ہاتھ اٹھا بیٹھتا ہے۔ پس مسلمانوں کو جو شکایات ہیں ان کو ملک کے عام حالات کے پس منظر کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔ مسلمان ایک کُل کا جز ہیں۔ جب کُل ہی صحت مند نہیں تو جز صحت مند کیسے ہو سکتا ہے۔ ملک کے مختلف طبقات میں اگر ذات پات کے، زبان کے اور علاقائی حدبندی کے تعصبات پائے جاتے ہیں اور ان کی بنیاد پر آئے دن شکست و ریخت اور حرب و ضرب کے ہنگامے برپا رہتے ہیں تو اگر مذہب کے نام پر بھی مفسدہ پردازوں کے ایک گروہ نے من مانی کرنے کی ٹھان لی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ بہرحال ملک کی عام ناگفتہ بہ اور تباہ کن صورت حال کے اصل اسباب حکومت کی نااہلیت اور کمزوری اور عوام میں جمہوریت کی قدروں کا عدم احساس یہی دو ہیں۔ کم و بیش کا فرق ہے۔ لیکن مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اس کے اسباب بھی یہی ہیں، اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمانوں کو جو شکایات ہیں وہ محض اس لیے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں!! معاشرہ میں جب تک فساد ہے مسلمانوں کو بہ حیثیت ایک فرقہ کے کامل اطمینان کبھی نہیں

Marfat.com

ہوسکتا۔ معاشرہ جب سدھر جائے گا تو مسلمانوں کو بھی اطمینان ہو جائے گا اور مسلمانوں کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے آپ کو سدھار لیں تو معاشرہ کے سدھارنے میں بھی وہ ایک بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں دستور نے جو حقوق مسلمانوں کو دیے ہیں ان پر اگر کہیں زد پڑتی ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا یہ مسلمانوں کا آئینی حق ہے وہ انھیں کرنا چاہیے اور وہ کرتے بھی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ نہ بھولیے کہ احتجاج کے حق کا آئینی ہونا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اس ملک کے شہری حقوق میں کسی سے کم نہیں، بلکہ برابر ہیں، مغلوب نہیں بلکہ شریک ہیں، محکوم نہیں بلکہ ساتھی ہیں۔

اندیشے اور خدشے

شکایات کے علاوہ بعض اندیشے اور خدشے بھی ہیں مثلاً بعض مسلمان کہتے ہیں کہ بے شبہ اس وقت تو مسلمانوں کو مذہبی آزادی مکمل طور پر حاصل ہے لیکن دستور میں ایک دفعہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسٹیٹ تمام ملک میں ایک ہی سول قانون رائج کرنے کی کوشش کرے گی[۵۱] اگر ایسا ہوا تو مسلمانوں کے پرسنل لا کا کیا ہوگا؟ اور پھر مذہبی آزادی کہاں رہے گی؟ جواب یہ ہے کہ اول تو پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں وزیر قانون اعلان کر چکے ہیں کہ سول کوڈ کسی فرقہ پر زبردستی تھوپا نہیں جائے گا۔ علاوہ ازیں آپ کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ ملک کے لیے جو عام سول کوڈ بنے گا وہ اسلامی قوانین کے خلاف ہی ہوگا۔ ممکن ہے وہ اسلام کے مطابق ہو جیسے ہندو کوڈ بل میں متعدد دفعات اسلامی تعلیمات کا چربہ ہیں۔ اور پھر اگر اس میں کوئی بات مسلم پرسنل لا کے خلاف ہوئی بھی تو آپ کو پورا حق ہے اس کے خلاف آواز اٹھانے اور اگر ضرورت ہو تو سپریم کورٹ کو کھٹکھٹانے کی! یہ یاد رکھیے یہ حق سب مسلم ممالک میں بھی نہیں ہے۔

بہرحال فقہا نے دارالحرب کی تعریف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اور پھر ہندوستان میں دستوری طور پر مسلمانوں کو جو پوزیشن حاصل ہے ان سب کو پیشِ نظر رکھا جائے تو حسب ذیل تنقیحات پیدا ہوتی ہیں:

---

۵۱ PART IV ARTICLE 44

Marfat.com

(۱) ہندوستان چوں کہ ایک سکولر جمہوری ملک ہے اس لیے یہاں کسی مذہب یا کسی مذہبی فرقہ کی حکومت نہیں ہے اس بنا پر فقہا کی اصطلاح میں "غلبۂ کفر" یہاں صادق نہیں آتا۔

(۲) شہری حقوق میں یکساں ہونے کے باعث مسلمان حکومت میں شریک ہیں۔

(۳) مذہبی آزادی کی دفعہ کے ماتحت مسلمانوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے۔

(۴) مسلمانوں کو معاشی اور تقریر و تحریر کی آزادی بھی حاصل ہے۔

(۵) انڈین یونین کے ڈپلومیٹک تعلقات تمام اسلامی ملکوں سے ہیں۔ اس کے علاوہ دوستانہ تعلقات و مراسم بھی ہیں کسی سے کم کسی سے زیادہ۔

(۶) انڈین یونین کی شمال مغربی سرحد مسلم ممالک سے متصل ہے۔ لاہور سے لے کر مراکو تک یہ سلسلہ چلا گیا ہے۔

ان تنقیحات کی روشنی میں یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ دارالحرب ہونے کے جو شرائط ہیں اور جو ایک لفظ "استیلا" میں جمع ہو گئے ہیں (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) ان میں سے چونکہ کوئی ایک شرط بھی نہیں پائی جاتی اس لیے ہندوستان ہرگز ہرگز دارالحرب نہیں ہے اور نہ اس جیسا کوئی اور جمہوری ملک جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو دارالحرب ہو سکتا ہے۔

یہ مسئلہ اس درجہ صاف اور واضح ہے کہ اور تو اور پاکستان کے دو نامور محقق اور فاضل اسلامیات نے بھی یہی لکھا ہے۔ چنانچہ جنوبی افریقہ کے متعلق استفتا اور دارالعلوم دیوبند کے دارالافتا کی طرف سے اس کا جواب (جس کا ان صفحات میں ذکر آچکا ہے) پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر صغیر احمد معصومی ہندوستان اور اسی جیسی دوسری جمہوریتوں کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں :-

"دارالحرب کی جو تعریف بیان کی گئی ہے۔ نیز قرونِ اولیٰ میں دارالحرب و دارالاسلام کے جو تعلقات تھے اور جو جنگی نتائج مرتب ہوتے تھے۔ ان سب پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آج کل کی سلطنتوں اور ریاستوں کو جہاں بدنظمی نہیں بلکہ ایک خاص نظام قائم ہے اور مسلمان با امن و امان رہتے ہیں بلکہ اپنی تعداد کے مطابق سیاسی امور میں بھی حصہ لیتے ہیں دارالحرب قرار نہیں دیا جا سکتا۔"[۱]

---

[۱] ماہنامہ الرحیم حیدرآباد (مغربی پاکستان) بابت جون ۱۹۶۳ء ص ۱۷-۶۷

Marfat.com

نفثۃ المصدور

اور

ہندوستان کی شرعی حیثیت

از

سعید احمد اکبر آبادی

Marfat.com

دوسرے صاحب پروفیسر محمد شریف مرحوم ہیں جنھوں نے لکھا ہے :-

"ہندوستان کا دستور اگرچہ سیکولر ہے لیکن اس میں عقیدہ، عمل اور مذہب کی آزادی دی گئی ہے وہ بعینہ وہ ہے جو اسلام دیتا ہے۔ اس بنا پر لفظوں کا فرق ہے ورنہ پاکستان کی اسلامی ریاست اور ہندوستان، آسٹریلیا اور امریکہ کی سیکولر ریاستیں یہ سب ایک ہی ہیں"[1]

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان دارالحرب نہیں ہے تو کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں جو دو مغالطے پیش آتے رہے ہیں انھیں دور کر دیا جائے:

دارالاسلام اور دارالحرب میں نسبت کون سی ہے؟

پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اسلام میں دار دو ہی ہیں۔ ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالحرب اور ان دونوں میں نسبت تناقض کی ہے یعنی اگر کوئی ملک دارالاسلام نہیں ہے تو وہ دارالحرب ضرور ہوگا اور اسی طرح اگر وہ دارالحرب نہیں تو لازمی طور پر دارالاسلام کہلائے گا۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر غلط فہمی ہے جو ہمارے علماء کو شروع سے آج تک پیش آتی رہی ہے اور اسی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن ممالک پر درحقیقت نہ دارالحرب کی تاریخ صادق آتی ہے اور نہ دارالاسلام کی (مثلاً انگریزوں کے زمانہ کا ہندوستان کہ اس میں مذہبی آزادی اور معاشی آزادی تو تھی لیکن اسلام کا قانون نافذ نہ تھا) ان کے متعلق علماء میں اختلاف پیدا ہو گیا، کسی نے ان کو دارالحرب کہا اور کسی نے دارالاسلام اور کسی نے کوئی ایک دو ٹوک بات کہنے سے انکار ہی کر دیا، حالانکہ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں میں نسبت تناقض کی نہیں جو ایک کا ارتفاع دوسرے کے وجود کو مستلزم ہو، بلکہ یہ دونوں وجودی ہیں اور اس بنا پر ان میں تضاد کی نسبت ہے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ملک دارالحرب بھی ہو اور دارالاسلام بھی۔ البتہ ایک ملک ایسا ہو سکتا ہے کہ نہ دارالحرب ہو اور نہ دارالاسلام۔

کیا دارالعہد والامن دارالحرب کے اقسام ہیں

دوسرا مغالطہ جو در اصل پہلے مغالطہ کا ہی شاخسانہ ہے

---

[1] ISLAMIC AND EDUCATIONAL STUDIES. P. 6.
(INSTITUTE OF ISLMIC CULTURE, LAHORE)

نتیجہ یہ ہے کہ دار الحرب سے ہجرت ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ دار الحرب دار الامان بھی ہو سکتا ہے اور دار العہد بھی۔ چنانچہ مولانا محمد سہول سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند مولانا گنگوہی کے مذکورۃ الصدر فتوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دار الامان ہے۔ یعنی جس طرح حبشہ قبل ہجرت شریعت کے باوجود دار الحرب ہونے کے دار الامان تھا اسی طرح سے آجکل ہندوستان بھی دار الامان ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت ضروری نہیں ہے۔"

اس دعوی کے ثبوت میں فتح الباری اور اشعۃ اللمعات سے دو عبارتیں نقل کرنے کے بعد بطور حاصل بحث کے لکھتے ہیں :۔

"خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سب سے اول مدینہ منورہ ہی دار الاسلام بنا ہے اور اس کے قبل دو ہی قسم کے دار الحرب تھے۔ دار الامان جیسے حبشہ اور دار خوف و شر جیسے مکہ مکرمہ۔"[1]

یہی رائے مولانا محمد میاں مراد آبادی کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"غیر مسلم اسٹیٹ کو دار الحرب کہا جاتا ہے۔ اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن و حفاظت کا کوئی معاہدہ ہو یا اس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے ماتحت محفوظ رہیں۔ اگر وہ اسٹیٹ نہیں ہے تو دار الاسلام نہیں ہے۔"

اس کے بعد حبشہ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"لیکن ہر دار الحرب سے نکل جانا ضروری نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ صحابہ کو حبشہ بھیج دیا تھا، حالانکہ وہ بھی دار الحرب تھا۔ مگر وہاں مسلمانوں کو امن مل جاتا تھا۔"[2]

---

[1] فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام، آخری صفحہ

[2] اخبار الجمعیۃ دہلی مورخہ ۲۷ رمئی ۱۹۶۶ء ص ۴

مولانا نجم الدین اصلاحی جنھوں نے مکتوبات شیخ الاسلام کو مرتب کیا اور اس پر فاضلانہ حواشی لکھے ہیں انھوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

" دار حرب کی دو قسمیں ہیں، دار الامن اور دار الفرار (اصل کتاب میں غلطی سے قرار چھپ گیا ہے) دار الامن وہ ہے کہ اس میں مسلمان بادشاہ اور اسلامی قوانین نہیں ہیں، لیکن مسلمان وہاں عبادت میں آزاد ہیں جیسے ہندوستان یا صلح حدیبیہ کے بعد مکہ معظمہ۔ دار الفرار وہ ہے جس جگہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی نہ ہو .... خلاصہ یہ کہ دار الحرب کے اقسام میں سے دار الامن ہے جس کو دار السلم بھی کہہ سکتے ہیں"[1]

اب ذرا غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے یہ اصطلاح بنا لی ہے کہ وہ آگ کو برف اور برف کو آگ کہے گا تو بات دوسری ہے، کیونکہ لامشاحۃ فی الاصطلاح ورنہ سچی بات یہ ہے کہ دار الامان اور دار السلم کو دار الحرب کی قسم قرار دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ آگ کی قسم ایک ایسی بھی ہے جو جلاتی نہیں ہے۔ یا ایلوہ کی قسم ایک ایسی ہے جو کڑوی نہیں ہوتی۔ حرب و قتال اور سلم و امان (WAR AND PEACE) دونوں متضاد ہیں، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک موضع میں بیک وقت دونوں کا اجتماع ہو جائے۔ اگر کسی چیز کو بیک وقت آپ سیاہ اور سفید اور کسی عورت کو بیک وقت بیوی اور اجنبیہ نہیں کہہ سکتے تو بے شبہ ایک ملک کو دار الحرب اور دار الامان معاً بھی نہیں کہہ سکتے، اصل یہ ہے کہ دار الامان اور دار العہد دار الحرب کی قسمیں نہیں ہیں، بلکہ قسیم ہیں، اور اس بنا پر دار کی دو قسمیں نہیں ہیں بلکہ چار ہیں یعنی (۱) دار الاسلام (۲) دار الحرب (۳) دار الامان (۴) دار العہد، اور چونکہ یہ باہم قسیم ہیں اس لیے ایک قسم دوسری قسم کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

غلط فہمی کی بنیادی وجہ

اس غلط فہمی کی بنیادی وجہ ایک اور عام غلط فہمی ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی معاشرتی تعلقات کے بارے میں ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ چونکہ اسلام اور کفر میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی اور یہ دونوں طبیعت اور فطرت کے

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام، ج ۱ ص ۱۶۹ (حاشیہ)

Marfat.com

اعتبار سے باہم متحارب ہیں اس بنا پر جس ملک میں کفر کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا وہ طبعی طور پر دار الحرب ہی ہوگا، لیکن حق یہ ہے کہ دو چیزیں بالکل الگ ہیں، ایک ہے نفس ایمان اور کفر کا باہمی تعلق اور دوسری ہے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دنیوی اور معاشرتی تعلقات اور روابط جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور ان میں مسالمت یا مصالحت ممکن نہیں ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات و روابط کا تعلق ہے تو اس میں بڑی وسعت ہے، اس کے متعدد اقسام و انواع ہیں اور معاشرتی و سماجی زندگی میں اسلام غیر مسلموں کے ساتھ بھی وہی اعلیٰ اخلاق و فضائل برتنے کا حکم دیتا ہے جن کا حکم وہ مسلمانوں کے ساتھ برتنے کا دیتا ہے، اسلام وحدت انسانیت کا بھی داعی ہے اور مساوات انسانی کا بھی، جس طرح اسلام کا خدا رب العالمین ہے اسی طرح اس کا پیغمبر رحمۃ للعالمین ہے۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کو اصلاً باہم متحارب اور عہد و صلح کو ایک امر عارضی قرار دیا جائے اور اسی ایک بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جائے کہ غیر مسلموں کا ملک اصلاً "دار الحرب" ہوگا۔ اس فرق کو آپ اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شرک کو قرآن نے نجاست کہا ہے مگر مشرک کو جسمانی اور مادی اعتبار سے نجس کوئی نہیں کہتا، چنانچہ اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور ایک ہی مکان میں رہنا سہنا سب جائز ہے۔

ہم نے اوپر دار کی چار قسمیں بیان کی ہیں ان میں پہلی قسم یعنی دار الاسلام تو خارج از بحث ہی ہے اب رہیں باقی تین قسمیں تو اب ہم قرآن مجید اور تاریخ و سنت سے ان کا ثبوت پیش کرتے ہیں:۔

اس سلسلہ میں ہمیں امور ذیل پر غور کرنا چاہیے:۔

(الف) از روئے قرآن غیر مسلموں کے ساتھ اصل حرب یا صلح و آشتی۔ اسی کو آج کل کی اصطلاح میں ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام پُر امن حیاتِ باہم (PEACEFUL CO-EXIST-ENCE) یا "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" (LIVE AND LET LIVE) کا قائل ہے یا نہیں۔

(ب) اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو قرآن میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی کتنی

Marfat.com

قسمیں ہیں؟ اگر ایک نہیں بلکہ کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور کوئی قسم کسی دوسری قسم کی تابع نہیں تو اس سے خود بخود یہ ثابت ہو جائے گا کہ تعلقات کی جتنی قسمیں ہیں اتنی ہی غیر مسلم ممالک کی قسمیں ہوں گی اور وہ سب مستقل بالذات ہوں گی۔

پُرامن بقائے باہم

اب آئیے پہلے اس پر بحث کریں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے سلسلہ میں اصل حرب کو قرار دیتا ہے یا پُرامن بقائے باہم کو، ہر شخص جس نے قرآن پر ایک نظر بھی ڈالی ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن میں فتنہ و فساد، شر انگیزی اور ظلم وجور کی جگہ جگہ سخت مذمت اور فتنہ انگیزوں کے لیے شدید وعید بیان کی گئی ہے۔ یہاں تک فرمایا گیا:-

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ — فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت (یعنی ناقابل برداشت) ہے

ایک مسلمان اور غیر مسلم میں مذہب کے سوا اور کسی چیز کا اختلاف نہیں ہے۔ اس بنا پر مذہب کی تبلیغ اور اس کی طرف دعوت جس طرح ہر انسان کا ایک طبعی حق ہے مسلمان کا بھی ہے۔

ساری دنیا کا ایک مذہب نہیں ہو سکتا

لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں یاد رکھنے کے لائق ہیں، ایک یہ کہ فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ جس طرح ہر چیز میں یہاں تنوع اور رنگا رنگی ہے اسی طرح مذہب بھی ایک نہیں ہو سکتا اور اس میں اختلاف و تنوع برابر قائم رہے گا۔ چنانچہ حضور پر نور ؐ کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

(۱) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ [۱]

اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک امت ہی بنا دیتا اور یہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر تیرے رب نے رحم کیا ہے، اور اسی لیے ان کو پیدا کیا ہے۔

(۲) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [۲]

اور اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں وہ سب ہی ایمان لے آتے تو کیا (پھر بھی) آپ لوگوں پر جبر کریں گے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔

۱؎ سورۂ ہود ۱۱۸-۱۱۹۔

۲؎ سورۂ یونس ۹۹

Marfat.com

(۳) وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ [لہ]

اگرچہ ان لوگوں کی روگردانی آپ پر بہت شا(ق ہے) لیکن اگر آپ کے بس میں ہے (تو چاہیے) زمین میں سرنگ یا آسمان کے لیے کوئی زینہ تلاش کر لیجیے (اور ان) لوگوں کے لیے ایک نشانی لے آئیے (جسے دیکھ کر سب ایمان...) اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر ہی د(یتا) پس آپ نادان نہ بنیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ عام لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۖ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۙ [سلہ]

اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن خدا نے جو کچھ تمھیں دیا ہے اس میں وہ تمھارا امتحان لینا (چاہتا ہے) اس لیے نیکیوں میں مسابقت کرو، خدا ہی کی طرف تم سب کو لوٹ جانا ہے اور پھر (قیامت میں) جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے تھے خدا ان سے تم کو آگاہ کرے گا۔

ان آیات کا منشا یہ ہے کہ جب یہ اختلافِ ادیان و مذاہب بحکمِ مشیت ایزدی قائم و برقرار رہے گا ہی تو تبلیغ و دعوت الی اللہ جو تمھارا فرض ہے وہ انجام دیے جاؤ لیکن محض اختلافِ مذہب کی بنیاد پر کسی سے شخصی مخاصمت اور دشمنی رکھنا دین حق کی تعلیم نہیں ہے۔ مرض چھوٹا ہو یا بڑا بہر حال قابل نفرت ہے اور اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، لیکن جو شخص آپ کے خیال میں مریض ہے وہ آپ کی نفرت کا نہیں بلکہ ہمدردی کا مستحق ہے۔

مذہب میں جبر و اکراہ نہیں ہے

اور دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات کے پہلو بہ پہلو ہی وہ آیات ہیں جن میں حضورؐ کو خطاب کر کے صاف صاف فرمایا گیا کہ آپ صرف مبلغ ہیں، مذکر ہیں، آپ نہ ان لوگوں پر مسلط ہیں اور نہ آپ ان کے اجارہ دار ہیں پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ مذہب میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہو سکتا۔ حق اور ناحق دونوں وضاحت

لہ الانعام ۳۵

سلہ المائدۃ آیت ۴۸

ساتھ بیان کر دیے گئے۔ اب جس کا جو جی چاہے کرے۔ جو جیسا کرے گا خدا کے ہاں ویسا ہی
ے گا۔ چنانچہ آیات ذیل پر غور فرمایئے:

فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ	پس آپ نصیحت کیجیے۔ آپ نصیحت کرنے والے ہی ہیں
عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝	آپ ان پر مسلط نہیں ہیں مگر ہاں جو شخص سرکشی اور کفر کریگا
فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۝ اِنَّ	تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ بے شبہ ہماری
اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا	ہی طرف ان سب کو آنا ہے اور ہمارے
حِسَابَهُمْ ۝ (الغاشیہ آیت ۲۱)	ذمہ ہی ان کا حساب ہے۔

یہ آیات مکی ہیں جب کہ مسلمان کمزور اور تعداد میں بہت کم تھے، لیکن مدینہ میں جب ان کی
تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ایک عظیم الشان طاقت وقوت کے مالک تھے، وہاں بھی تبلیغ کے
سلسلے میں جو احکام نازل ہوئے وہ سب یہی تھے، چنانچہ مدنی آیات ہیں:۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ	آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ	کرو لیکن اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو پھر پیغمبر اپنے بوجھ
مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا	کا ذمہ دار ہے اور تم لوگ اپنے بوجھ کے، اور اگر تم پیغمبر
عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ	کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور پیغمبر
الْمُبِيْنُ (النور آیت ۵۴)	کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ	دین میں کوئی جبر نہیں ہے، ہدایت گمراہی
مِنَ الْغَيِّ (البقرہ آیت ۲۵۶)	سے متمایز ہو گئی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ	اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو (اے محمدؐ) آپ کہیے:
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ	"میرے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور
وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ	معبود نہیں ہے، میں نے اس پر ہی بھروسہ کیا ہے
(التوبہ)	اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔

Marfat.com

اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں جبر و اکراہ کی نفی ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ جو ایمان جبر و اکراہ سے قبول کیا جائے اور اس میں دل کی خواہش اور رضامندی کو دخل نہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ پس جب زبردستی کا ایمان معتبر ہی نہیں ہے تو پھر جبر و اکراہ کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے۔ ارشاد حق بنیاد ہے

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا: آمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ۝

(مومن، آیت ۸۵)

پس جب ان لوگوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو بولے "ہم ایک خدا پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو خدا کے ساتھ ہم شریک مانتے تھے اب ہم ان کا انکار کرتے ہیں"۔ لیکن ہمارا عذاب دیکھنے پر ان کا ایمان لانا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوا۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ دیرینہ سنت یہی ہے اور ایسے موقع پر کافر بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔

عذاب الٰہی کی طرح موت بھی ایک جبر ہی ہے اس بنا پر جس طرح نزول عذاب کے وقت ایمان لانا معتبر نہیں تھا اسی طرح موت کے شکنجہ میں پھنس کر ایمان کے اقرار کا کوئی اعتبار نہیں چنانچہ فرمایا گیا:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ: إِنِّي تُبْتُ الْآنَ

(النساء رکوع ۳)

اور توبہ اُن بدکاروں کی معتبر نہیں ہوتی جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے "میں نے اب توبہ کر لی ہے"۔

اگر اسلام میں جبر جائز ہوتا تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ اپنے غیر مسلم غلام کو مسلمان بناتے۔

اب شر و فساد، ظلم و جبر کی مذمت، وحدت انسانیت، مساوات انسانی اور عدل وانصاف کی تاکید کے بارے میں جو آیات ہیں ان کو مذکورہ بالا آیات کے ساتھ ملا کر پڑھیے

Marfat.com

تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض اختلافِ مذہب کے باعث غیر مسلموں کے ساتھ ان مکارمِ اخلاق اور فضائلِ علیا سے گر کر معاملہ کرنا جن کا حکم اسلام دیتا ہے جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ بتوں کا سب وشتم، مذاق اڑانا، پھبتی کسنا، نام بگاڑنا تک جائز نہیں ہے۔ پس جب یہ ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم کو جو مسلم مملکت میں نہیں رہتا اس کو حربی اور اس کے ملک کو بہر حال دار الحرب کہا جائے اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام "بر امن بقائے باہم" کا سرگرم حامی اور داعی ہے اور اس کے فلسفۂ حیات میں اصل امن وامان، مصالحت ومسالمت ہے اور جنگ فقط ایک امر عارض وزوال پذیر ہے ٹھیک اسی طرح جیسے صحت، خوشی، نیکی زندگی کی اصل حقیقتیں ہیں اور ان کے بالمقابل مرض، درد وغم اور بدی عارضی امور ہیں۔ چنانچہ ایک آیت میں دنیا کے سب لوگوں کے ساتھ امن وامان اور صلح وآشتی کے ساتھ رہنے کا عہد وپیمان کرنے کا حکم صاف لفظوں میں دیا گیا ہے اور اس راہ میں جو وساوس وخطرات پیش آتے ہیں ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ (البقرہ رکوع ۲۵)	اے ایمان والو! تم سب صلح وآشتی میں داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، وہ بے شبہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

حرب وضرب اور قتال کا حکم

مرض، درد وغم اور بدی امورِ عارضی سہی لیکن بہر یہ بھی اس دنیا کی حقیقتیں ہیں اور جب تک ان سے حفاظت اور بچاؤ اور کم از کم ان پر قابو پانے کا بند وبست نہ ہو زندگی میں سکھ اور چین میسر نہیں آ سکتے، اس بنا پر اگر انسان کے لیے فرشتہ بننا ممکن نہیں ہے تو جنگ بھی ناگزیر ہے۔ قرآن میں جنگ کے احکام ومسائل اور اس کے متعلقات کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ جنگ کا مقصد فتنہ وفساد کی بیخ کنی ہے اور یہ فساد خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف اور غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ قرآن نے ان دونوں قسموں کو بیان کر کے ان کے احکام بھی بتائے ہیں، پہلی قسم کے متعلق ارشاد ہے:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ	اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے

Marfat.com

اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ج فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (الحجرات رکوع ۱)

درمیان صلح و صفائی کرا دو، لیکن اگر ایک گروہ نے دوسرے گروہ پر زیادتی کی ہے تو اب تم اس گروہ سے جنگ کرو جو زیادتی کر رہا ہے اور اس وقت تک جب تک یہ گروہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ نہ آئے۔

اس آیت میں مسلمانوں کی باہمی جنگ کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں:۔

(الف) دونوں گروہ کسی غلط فہمی یا اجتہادی خطا کے باعث لڑ رہے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دونوں میں غلط فہمی رفع کر کے صلح و صفائی کرائی جائے۔

(ب) ایک گروہ حق پر ہے اور دوسرا باطل پر۔ ایک مظلوم ہے اور دوسرا ظالم: اس کا یہ حکم ہے کہ ظالم سے جنگ کی جائے اور اسے انتہا تک پہنچایا جائے۔

اور اگر یہ فساد اور شر غیر مسلموں کی طرف سے ہو تو پھر ان سے بھی جنگ کرنی چاہیے لیکن اسلام کے فلسفۂ اخلاق میں جنگ کی حیثیت "علاج بالمثل" یا "جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا" کی ہے۔ اس بنا پر حکم ہے کہ مقصد جب حاصل ہو جائے تو فوراً ہاتھ روک لو اور ہرگز حد سے قدم آگے نہ رکھو، ورنہ خدا کے ہاں سخت پکڑ ہوگی۔ آیاتِ ذیل ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (البقرۃ رکوع ۲۴)

اور اللہ کے راستہ میں تم ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ (البقرۃ رکوع ۲۴)

اور جس نے تم پر دست درازی کی ہے تم بھی بس اتنی دست درازی اس پر کرو۔

(۳) وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ (النحل رکوع ۱۶)

اور اگر تم ان کو عذاب دینے لگو تو بس اتنا عذاب دو جتنا کہ تم کو دیا گیا تھا۔

اس سے بڑھ کر حسن اخلاق، شرافتِ نفس اور لطف و کرم کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگرچہ اس آیت میں برابر سرابر بدلہ لینے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی صبر کا مرتبہ بہت اونچا بتایا گیا ہے:

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ

اگر تم صبر کرو تو بے شبہ وہ صبر کرنیوالوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔

Marfat.com

135353

Marfat.com

غیر مسلموں کی قرآن میں تین قسمیں

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام میں جنگ کا مقصد کیا ہے؟ وہ کیوں مشروع کی گئی ہے؟ اور امن کے کیا حدود ہیں؟ تو اب یہ معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے کے سلسلہ میں جنگ، صلح اور امن کی تین حالتیں بیان کی گئی ہیں، انھیں تین حالتوں کے اعتبار سے ان کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کے لیے الگ الگ احکام ہیں اور انھیں احکام کی وجہ سے غیر مسلم ممالک تین قسم کے دار میں تقسیم ہوتے ہیں۔

اہل مریخ و مرنجان

ایک قسم اُن غیر مسلموں کی ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا نہ کوئی معاہدہ ہے اور نہ جنگ۔ یہ لوگ مریخ و مرنجان قسم کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات نہیں ہیں تو یہ ان کے درپے آزار بھی نہیں ہیں۔ یہ نہ خود ستاتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے خلاف کسی سازش میں شریک ہیں مسلمانوں کو صاف حکم ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور لطف و کرم کا معاملہ کریں۔ ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ [1]

اے مسلمانو! جن لوگوں نے مذہب کی بنیاد پر تم سے جنگ نہیں کی اور تم کو ترک وطن پر مجبور نہیں کیا اللہ تم کو اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ کرو، بے شبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

جو حضرات قرآن کے اسلوب کلام کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس آیت میں اگرچہ لفظ "لا ینھاکم" کے ہیں جس سے محض اباحت و اجازت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے لیکن درحقیقت مراد وجوب ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ایک دو نہیں متعدد مواقع پر "لَاجُنَاحَ" بولا گیا ہے اور وجوب مراد ہے۔ یہی مضمون ایک دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا

پھر اگر وہ لوگ تم سے دو چار نہ ہوں اور تم سے جنگ نہ

---

[1] المتحنہ رکوع ۲

اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلًا ۔ ؎۱

کریں اور تم سے صلح کے خواہاں ہوں تو خدا تم کو ان پر زور چلانے کی اجازت نہیں دے گا۔

ارباب عہد و صلح

دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جن سے مسلمانوں کا عہد و پیمان ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کے احکام بالکل صاف و صریح یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عہد و پیمان کی پابندی صورت اور معنیٰ دونوں اعتبار سے کرنی چاہیے، عہد شکنی، غدر، خیانت اور فریب دینا پہلے درجہ کے معاصی کبیرہ میں سے ہے بلکہ یہاں تک حکم ہے کہ اگر مسلمانوں کو کن بھن بھی اس بات کی پہنچے کہ غیر مسلم دھوکہ دینے کا ارادہ کر رہے ہیں تو اس وقت بھی وہ اللہ پر بھروسہ کریں۔ اور اپنی طرف سے پہل اس وقت تک نہ کریں جب تک وہم و ظن یقین سے نہ بدل جائے۔

چنانچہ ارشاد ہوا:۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ۔ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْکَ فَاِنَّ حَسْبَکَ اللّٰہُ ؎۲

اور اگر وہ لوگ تم سے صلح کرنے پر آمادہ ہوں تو (اے محمدؐ) آپ ان سے صلح کر لیجئے اور اللہ پر بھروسہ رکھیے، بے شبہ وہ سننے اور جاننے والا ہے اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینے کا ارادہ کریں تو آپ (پرواہ نہ کریں) بس اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ ؎۳

اور جو شخص تم سے سلامتی اور صلح کی درخواست کرتا ہے اس سے تم یہ نہ کہو کہ تو ایمان دار نہیں ہے، تم اس دنیا کے ساز و سامان کی طلب کرتے ہو درآنحالیکہ اللہ کے پاس بڑی بڑی نعمتیں ہیں تم (اسلام سے پہلے) ایسے ہی (دنیا پرست) تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو عہد و پیمان ہوتا ہے، خدا نے خود اس کو اپنا عہد کہا ہے، اور اس بنا پر اس پر ثابت قدم رہنے کی سخت تاکید کی ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عٰھَدْتُّمْ

اور جب تم معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو، اور

؎۱ نساء رکوع ۱۲ ۔ ؎۲ الانفال رکوع ۸، آیۃ ۶۱-۶۲ ۔ ؎۳ النساء رکوع ۱۳

Marfat.com

وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ عَلَیْکُمْ کَفِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ م بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا م بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ هِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ ؕ لے

قسموں کو مؤکد کرنے کے بعد ان کو نہ توڑو، درانحالیکہ تم نے اپنے اوپر اللہ کو کفیل بنالیا ہے جو کچھ تم کرتے ہو بیشک اللہ اس کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو اور اس عورت کی طرح مت بنو جو اپنا سوت کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کرکے توڑ دے، کہ تم اپنی قسموں کو اس وجہ سے فساد کا سبب بنانے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ طاقتور ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کا حکم اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ اگر ان غیر مسلموں کے خلاف کچھ مسلمان بھی مدد طلب کریں تو حکم ہے کہ ان کی مدد نہیں کرنی چاہیے :-

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ م بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ؕ لے

اگر وہ (مسلمان) دین کے معاملہ میں تم سے مدد کے طالب ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے۔ البتہ اس قوم کے خلاف نہیں جن میں تم اور تم میں عہد و پیمان ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں اگرچہ لفظ "قوم" ہے جس کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں پر ہوسکتا ہے لیکن "فی الدین" اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں قوم سے مراد غیر مسلم ہی ہیں کیونکہ مسلمان دین کے معاملہ میں جس مدد کے خواہاں ہیں وہ غیر مسلموں کے ہی خلاف ہوسکتی ہے۔

ایک اور آیت میں خاص مشرکین سے معاہدہ کا تذکرہ ہے :-

اِلَّا الَّذِیْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ

مگر ہاں جن مشرکین کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے، پھر

لے النحل ۹۱-۹۲ عہد جاہلیت میں قریش کا طریقہ یہ تھا کہ جس قبیلہ کو زیادہ طاقتور پایا اس سے معاہدہ کرلیا اور پھر اگر اس سے بھی زیادہ طاقتور کوئی اور قبیلہ ملا تو اس سے عہد و پیمان کرلیا اور پہلا معاہدہ توڑ دیا، اس آیت میں اس طریقہ کی مذمت اور معاہدہ کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے۔

لے الانفال : ۷۱

Marfat.com

ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ [1]

ان لوگوں نے تمھارا کوئی حق کم نہیں کیا ہے اور تمھارے برخلاف کسی کی مدد بھی نہیں کی ہے تو (اے مسلمانو) تم اس معاہدہ کی مدت تک اس کو پورا کرو، بے شک اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

مندرجۂ بالا اور ان کے علاوہ دوسری آیات میں مسلمانوں کو معاہدہ کی پابندی کا حکم جس تاکید اور قوت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کس طرح عمل کیا؟ اس کا اندازہ صلح حدیبیہ کے اس مشہور واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ابھی صلحنامہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو کا بیٹا ابو جندل زنجیروں میں گھسٹتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور آپ سے مدد طلب کی، لیکن چونکہ صلحنامہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ مکہ سے اگر مسلمان بھاگ کر ادھر آئے گا تو حضورؐ کے لیے اس کو واپس کر دینا ضروری ہوگا۔ اس بنا پر اگرچہ حضرت عمرؓ جیسے مسلمانوں کو ناگواری ہوئی لیکن حضورؐ نے اس کی ذرا پروا نہ کی اور صلحنامہ کی دفعہ متعلقہ کے مطابق ابو جندل کو اسی حالت میں مکہ واپس کر دیا[2]

اس موقع پر یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ معاہدہ میں فریقین کا پلڑہ برابر ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا پلڑہ کبھی کمزور بھی ہوسکتا ہے اور کبھی بھاری بھی۔ اول کی مثال یہی صلح حدیبیہ ہے جس کا رنج صحابہ کو عموماً اور حضرت عمرؓ کو خصوصاً اس درجہ تھا کہ اس تاثر کے تحت آپ کی زبان سے چند الفاظ جو بیساختہ نکل گئے تھے ان کا افسوس عمر بھر رہا۔ اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا ہی یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ابو رافع ایک قبطی تھے۔ قریش نے گفت وشنید کے لیے ان کو بھی بھیجا تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو مجھے اسلام کی طرف رغبت محسوس ہوئی اور میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اب میں ہرگز قریش کی طرف واپس نہ جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا:

انی لا اخیس بالعھد ولا احبس البرید ولکن ارجع فان کان فی نفسک الذی فی نفسک الآن فارجع

میں نہ تو عہد شکنی کرتا ہوں اور نہ قاصد کو قید کرتا ہوں اس لیے تم بہر حال واپس جاؤ پھر جو چیز اس وقت تمھارے دل میں ہے وہ اگر لوٹنے کے بعد ہو تو واپس آجانا۔

---

[1] التوبہ: ۴ [2] صحیح بخاری

اس ارشاد کے مطابق میں واپس چلا گیا اور اس کے بعد جب موقع ملا خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔[1]

اور دوسری صورت کی مثال وہ مصالحت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہود اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ کی تھی بہرحال مسلمانوں کی پوزیشن کچھ ہی ہو، قرآن کا حکم یہ ہے کہ جب معاہدہ ہے تو اس کی پابندی مکمل طور پر اور ایمانداری سے ہونی چاہیے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل رکوع ۴)

اور اپنا عہد و پیمان پورا کرو (قیامت کے دن) اس کے بارہ میں پوچھ گچھ ہوگی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام نے ان احکام کی پابندی اس طرح کی کہ امیر معاویہ اور اہلِ روم کے درمیان ایک معاہدہ تھا، جب اس معاہدہ کی مدت قریب ہونے کے قریب آئی تو امیر معاویہ ایک لشکر جرار لے کر اس ارادہ سے روانہ ہوئے کہ معاہدہ کے ختم ہوتے ہی دھاوا بول دیں گے، ابھی یہ لشکر راستہ میں تھا کہ ایک صحابی جن کا نام عمرو بن عبسہ تھا اچانک سامنے کی طرف سے بھاگتے ہوئے یہاں پہنچے اور امیر معاویہ سے بولے: "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جن لوگوں کا کسی قوم سے عہد ہو تو وہ اس کو اس وقت فسخ نہ کریں جب تک معاہدہ کی مدت نہ گذر جائے یا دونوں اس کو برابر برابر فسخ کرنے پر رضامند نہ ہو جائیں"۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی امیر معاویہ نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس ہو گئے۔

(سنن ابو داؤد کتاب الجہاد حدیث نمبر ۴۱۹ و ترمذی جلد اول)

دشمنانِ جنگجو

تیسری قسم اس غیر مسلم ملک یا قوم و قبیلہ کی ہے جو نہ غیر جانبدار ہیں۔ اور نہ ان سے مسلمانوں کا کوئی عہد و پیمان ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے درپے آزار رہتے ہیں، ان کے خلاف سازشیں کرتے اور گھر سے بے گھر کرتے ہیں، یہ لوگ قرآن کی اصطلاح میں "اربابِ اعتدار" ہیں اعتدا دو قسم کا ہوتا ہے ایک بالقوۃ اور دوسرا بالفعل، اگر اعتدار بالقوۃ ہو یعنی اگرچہ مسلمانوں پر ابھی تک کوئی حملہ نہیں ہوا ہے، لیکن ناقابلِ تردید ذرائع سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حملہ کی تیاریاں ہو رہی

---

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الجہاد حدیث نمبر ۴۱۸

ہیں تو قرآن میں حکم یہ ہے کہ اس کے جواب میں مسلمان بھی غافل نہ رہیں بلکہ پوری مستعدی اور بیدار مغزی کے ساتھ عصری آلاتِ حرب فراہم کرنے کی حسبِ استطاعت تیاری کریں۔ ارشاد ہے:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال ۶۰)

اور مہیا کرو اُن سے جنگ کرنے کے لیے وہ سب کچھ طاقت اور گھوڑے جو تمہارے امکان میں ہو، تاکہ تم ان کے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کرو۔

یہی وہ دشمن ہیں جن کی نسبت ایک اور مقام پر فرمایا گیا:۔

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (النساء ۱۰۲)

جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اسے پسند کرتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور ساز و سامان سے غافل ہو تو یہ لوگ تم پر اچانک حملہ کر دیں۔

اسی سلسلہ میں یہ آیت بھی ہے جس میں ارشاد ہوا:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید ۲۰)

بے شک ہم نے اپنے پیغمبر کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف قائم کریں اور ہم نے لوہا اُتارا ہے جس میں سخت رعب داب ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔

یہ سب کچھ اعتدا بالقوۃ کے سلسلہ میں تھا! اب رہی اعتدا کی دوسری قسم اعتدا بالفعل یعنی مسلمانوں پر سچ مچ دھاوا بول دیا گیا اور ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ہے تو اب قرآن کا حکم یہ ہے کہ تم ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرو، اور ان کو شکست دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو، یہی وہ دشمنانِ جنگ جو ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے:۔

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ

جن لوگوں نے (اے مسلمانو) تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تم کو گھروں سے نکالنے پر تمہارے دشمنوں کی مدد کی ہے اللہ تم کو ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے سختی کے سا

Marfat.com

يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (الممتحنہ ۹)

منع کرتا ہے اور جو ان کے ساتھ دوستی کرے گا دراصل ظالم وہی ہوگا۔

اسلام اور مسلمانوں کے یہی وہ دشمن اور حریفانِ نافرجام ہیں جن سے جنگ کرنے پر قرآن کی متعدد آیات میں مسلمانوں کو برانگیختہ کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں فرمایا گیا:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا (نساء رکوع ۱۰)

اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کے لیے اور ان کمزور مردوں اور بچوں کی خاطر جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہم کو اس بستی (آبادی) سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں۔

علاوہ ازیں قوم شمویل سے نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا (بقرہ رکوع ۳۲)

ان لوگوں نے (اپنے نبی سے کہا) "ہم خدا کی راہ میں کیوں نہ لڑیں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور اولادوں سے جدا کیے گئے ہیں۔

حرب و قتال کے سلسلہ میں یہ وہ آیات ہیں جو محرکات و لواعث جنگ کو متعین کرتی ہیں۔

ان سب کا خلاصہ اس آیت میں کر دیا گیا ہے:۔

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ (النساء آیۃ ۷۶)

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے راستہ میں قتال کرتے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ شیطان کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں۔

یہ اللہ کا راستہ (سبیل اللہ) کیا ہے؟ قرآن نے اس کو مبہم نہیں رکھا۔ یہ نیکی اور احسان، ضعیفوں اور کمزوروں کی مدد، دفع شر، دفع جور و ظلم، استیصال فتنہ و فساد، اور اقامت امن امان کی راہ ہے۔ اب جب جنگ چھڑ جائے تو حکم ہے کہ مسلمان بہادروں کی طرح لڑیں اور اس وقت تک نچلے نہ بیٹھیں جب تک شر و فساد کے بچھو کا ڈنک نہ مارا جائے، اس سلسلہ میں اس نوع کی آیات ہیں:۔

Marfat.com

(۱) وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ (الانفال رکوع ۵)

اور تم ان لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک کہ فتنہ ختم اور دین کل کا کل اللہ کے لیے نہ ہو جائے۔

(۲) اِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (الانفال رکوع ۱۰)

اگر تم ایسا (یعنی جنگ) نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور عظیم فساد ہو گا!

سطور بالا میں جو آیات نقل کی گئی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ایک ملک کے دوسرے ملک کے ساتھ اور ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ جو تعلقات ہوتے ہیں وہ تین قسم کے ہی ہوتے ہیں:

(الف) غیر جانبداری اور ناطرفداری (NEUTRALITY) کے۔ قرآن نے اس کو اعتزال کہا ہے۔

(ب) عہد و پیمان اور مصالحت و موادعت (TREATY OR ALLIANCE) کے۔

(ج) حرب و ضرب اور بغض و عداوت (WAR, HOSTILITY) کے۔

یہ تینوں حالتیں اور تعلقات کی یہ نوعیتیں مستقل بالذات ہیں، ایک دوسرے کے تابع اور اس کی قسم نہیں، پس اب لامحالہ اقوام غیر کے دار بھی تین قسم کے ہوں گے اور یہ تینوں مستقل بالذات ہوں گے، اور ان کی ترتیب یہ ہو گی: (الف) دار الامن (ب) دار العہد (ج) دار الحرب۔ اب اگر مسلمانوں کے ملک کو دار الاسلام کہا جاتا ہے شامل کر لیا جائے تو دار کی قسمیں دو یا تین نہیں بلکہ جیسا کہ ہم اس بحث کے شروع میں بتا چکے ہیں، چار ہوں گی۔[1]

دار الحرب میں سکونت جائز نہیں

علاوہ ازیں اس تقریر سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جب دار الحرب کہتے ہی اس ملک کو ہیں جس کی حکومت اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہو، مسلمانوں پر ظلم و تعدی کرتی ہو اور اس بنا پر دونوں میں جنگ بالفعل ہو یا جنگ کے سے حالات

---

[1] افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین کرام کے ایک طبقہ نے ان آیات کو باہم ایک دوسرے سے ٹکرا دیا ہے اور اس بنا پر ان کو ان ... نسخ کا قائل ہونا پڑا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ آیاتِ قتال آیاتِ صلح و موادعت کے لیے ناسخ ہیں۔ انھیں مفسرین کے زیر اثر وہ فقہائے کرام ہیں جو اصل دار دو قسم کے ہی مانتے ہیں، دار الاسلام اور دار الحرب اور پھر امن و امان یا عہد و پیمان کی کوئی صورت ... تو اس کو دار الحرب کی ہی ایک قسم قرار دے دیتے ہیں، لیکن ہم نے جو تقریر کی ہے اس کی روشنی میں تمام آیات ... اپنی جگہ قائم رہتی ہیں اور احکام میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی ان آیات کا منشا ہے۔

Marfat.com

قائم ہوں تو اب مسلمانوں کے لیے اس ملک میں سکونت رکھنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ جیسا مولانا نانوتوی نے لکھا ہے (حوالہ گزر چکا) وہاں سے ہجرت واجب ہوگی، چنانچہ قرآن مجید کی آیت ذیل ایسے ہی مسلمانوں کے بارے میں ہے جو دارالحرب سے ہجرت نہیں کرتے :

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (النساء رکوع ۱۴)	جن لوگوں نے ہجرت نہ کرکے اپنے اوپر ظلم کیا ہے جب ان کو موت آئے گی تو فرشتے ان سے کہیں گے "تم کیا ہو گیا تھا (جو ہجرت نہیں کی تھی) یہ کہیں گے" ہم ملک میں کمزور تھے" اب فرشتے کہیں گے "کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی جو تم اس میں ہجرت کرتے؟ لبس یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

ہجرت کے وجوب حکم سے اگر مستثنیٰ ہیں تو صرف وہ لوگ جو بیکس و بے بس ہیں اور جو نقل مکانی کی استطاعت ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا گیا:

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلَا یَھْتَدُوْنَ سَبِیْلًا فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ وَکَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوْرًا (النساء رکوع ۱۴)	مگر ہاں وہ کمزور (وہ عورتیں اور بچے جو کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور جنھیں کوئی راستہ ہی نہیں ملتا تو یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا ممکن ہے انھیں معاف کردے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، اور بخشنے والا ہے۔

ایک لطیفہ مولانا محمد میاں سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند جو دارالحرب سے ہجرت کو واجب قرار نہیں دیتے انھوں نے ایک عجب کمال کیا ہے۔ قرآن میں ایک آیت ہے جس میں دارالحرب سے ہجرت نہ کرنے والوں کے خلاف اظہار بیزاری و ناراضگی کیا گیا اور جو لطور خفگی سے دارالاسلام کے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ اچھا! اگر یہ لوگ ہجرت نہیں کرتے تو نہ کریں۔ یہ جانیں اور ان کا کام! اب اگر (دارالحرب میں رہنے کے باعث) ان کو کچھ نقصان بھی پہنچے تو اسے دارالاسلام کے مسلمانو! تم پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے[1] مولانا نے اس سے عدم وجوب ہجرت پر [illegible] لال

---

[1] وہ یہ آیت یہ ہے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا مَا لَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا (الانفال رکوع ۱۰)

Marfat.com

کیا ہے[51]۔ ذرا غور کیجیے تو یہ استدلال بھی ٹھیک ایسا ہی ہے "لکم دینکم ولی دین" اور "فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر" سے یہ ثابت کرنا کہ قرآن دین کے معاملہ میں ہر شخص کو اختیار دیتا ہے کہ وہ جو دین چاہے اختیار کرے۔

بہرحال قرآن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے دار الحرب میں سکونت اختیار کرنا حرام ہے اور جو ایسا نہیں کرتے ان کے لیے جہنم کی وعید شدید ہے۔ البتہ اس کے علاوہ جو اور دار ہیں یعنی دار الامان اور دار العہد ان میں رہنا بسنا اور توطن جائز ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے، اس کا دفع کرنا بھی ضروری ہے۔ اشکال یہ ہے کہ جب قرآن سے چار قسم کے دار ثابت ہوتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ کتب فقہ میں عام طور پر دار الاسلام اور دار الحرب صرف ان ہی دو داروں کا ذکر ملتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ مشہور یہ دو دار ہی ہیں لیکن امام شافعی اور امام محمد بن الحسن ایک تیسرا دار بھی مانتے تھے۔ چنانچہ السیر الکبیر میں امام محمد نے اس کا تذکرہ کرکے اسے دار موادعت بھی کہا ہے اور دار العہد بھی۔ شیخ ابو زہرۃ اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"ہمارے لیے یہ کہنا بالکل ممکن ہے کہ دار العہد دار حرب نہیں ہوتا۔ اور اگرچہ اس پر بعض احکام دار الاسلام کے بھی جاری ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایک مستقل بالذات دار ہوتا ہے"[52]

لیکن یہ جواب رفع اشکال کے لیے کافی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے، جیسا کہ شیخ ابو زہرہ نے لکھا ہے:

"جو زمانہ اجتہاد اور فقہ کی تدوین و ترتیب کا تھا اس میں صورت حال یہ تھی کہ عملاً تین قسم کے ہی دار تھے، ایک دار الاسلام، دوسرا دار الحرب اور تیسرا

---

[51] روزنامہ الجمعیۃ دہلی مورخہ ۷ مئی ۶۶ء صفحہ ۴ کالم ۲

[52] مقالہ "العلاقات الدولیۃ فی الاسلام" مطبوعۂ الازہر بابت مارچ ۶۴ء ص ۲۸۰